مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ کی دوسری پیشکش

Presented to ICCR Library.
K. [illegible] Ahmad
10th Sept. 1990

نقوش

ابوالکلام آزاد

یعنی

مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار عالیہ، اقوال زریں
کے ساتھ ساتھ ان کے متعلق دو تقریروں اور بلند پایہ
مقالات کا مجموعہ ---

محمد یونس خاں ندوی

ترتیب

اشاعت فروری ۱۹۶۸ء

کتاب کا نام .. .. نقوشِ ابوالکلام آزادؒ

مرتبہ .. .. محمد یونس خالدی

ناشر .. .. مولانا آزاد میموریل اکاڈمی
۷، بشیشر ناتھ روڈ لکھنؤ ۱

کاتب .. .. (منشی) عبد المجید

آرٹسٹ .. .. عظمت اللہ خاں

مطبع نامی پریس لکھنؤ

اپنی باتیں

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ کی شخصیت برصغیر ہند و پاک میں جسقدر متعارف اور مشہور رہی ہے اس قدر کوئی دوسرا مشہور و متعارف نہیں رہا، لیکن یہ بھی ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ عوام و خواص دونوں میں ان کے متعلق غلط فہمی یا ناقدر شناسی کی بدولت کچھ ایسی باتیں بھی زباں زد ہوتی جا رہی ہیں کہ جن سے حقیقتاً مولانا کا دامن پاک تھا۔

مولانا نے اپنی زندگی میں کبھی اس کو پسند نہیں کیا کہ ان کی شخصیت کو موضوع بحث بنایا جائے، اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ پھر بھی ان کی شخصیت موضوع بحث بنی ہوئی ہے۔ یہ بات مولانا کے عقیدت کیشوں کے لئے، بلکہ پورے ملک کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے، ضرورت تھی کہ ان غلط فہیموں کے بادلوں کو چھانٹا جائے، اور جو باتیں ان کے متعلق مشہور کی گئی ہیں، یا منسوب کی جا رہی ہیں، اس کی دلائل کے ساتھ تردید کی جائے، اسی کے ساتھ ہی ساتھ ان کے اسرار و معارف کا آنے والی نسل سے تعارف کرایا جائے، اسی حقیقت کے پیش نظر مولانا کی اٹھارویں برسی کے موقع پر "مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ" کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس نے یہ فیصلہ کیا کہ مولانا آزاد کی شخصیت کے ہر پہلو کو اکاڈمی کے ذریعہ اجاگر کیا جائے، ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل کا انتظام کیا جائے، ان کی شخصیت اور ان کے فکر و فن کے ہر گوشے پر تحقیقی کام کرنے کے لئے ارباب فضل و کمال کو آمادہ کیا جائے، ان کے نام پر ایک لائبریری کا قیام عمل میں لایا جائے، اور ہر سال مولانا کے یوم پیدائش اور یوم وفات کے موقع پر، ان کی شخصیت، اور ان کے علمی، ادبی، مذہبی، سیاسی کارناموں کے اجمالی تعارف کے لئے بلند پایہ کتابیں شائع کی جائیں، اور اجلاس عام کئے جائیں، جہانتک کتابوں کی اشاعت، اور اجلاس عام کا تعلق ہے، تو اس کا آغاز ہو چکا ہے، اجلاس عام کو مشاہیر ملک و ملت خطاب بھی کر چکے ہیں، اور بیش قیمت مقالے بھی پیش فرما چکے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد

ولادت
۱۹ر اگست ۱۸۸۸ء

وفات
۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء

یہ غریب الدیار عہد، ناآشنائے عصر، بیگانۂ خویش، نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا، وخرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد ومدعو بابی الکلام ہے، ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ ہجری میں ہستی عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمت حیات سے متہم۔ الناس نیام اذا ماتوا فانتبہوا :—

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقیست شب فتنہ، غنودیم

والد مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا، اور مصرعۂ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:-

"جواں بخت و جواں طالع جواں باد"

"تذکرہ" طبع اوّل
صفحہ ۲۸۷ و ۲۸۸

پیش گفتار

مولانا غلام رسول مہر (مرحوم) نے سچ لکھا ہے، کہ

"مولانا (ابوالکلام آزاد) کے وجود گرامی کی بدولت جو مسند ارشادات و ہدایت جنت نگاہ اور فردوس قلب و روح تھی، وہ دوبارہ خدا جانے کب ویسی ہی ضیا باریوں اور جلوہ کاریوں سے مطلع انوار کی صورت اختیار کر سکے، زمانے کے انداز بدل گئے، وہ سانچے بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے، جس کے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں، اور فکر و عمل کی نادر روزگار استعدادیں تربیت پاکر ابوالکلام آزاد بن سکتی تھیں، دین و سیاست، علم و تحقیق، فلسفہ و حکمت، ادب و شعر، دعوت و ارشاد، غرض کون سا دائرہ تھا، جس میں مولانا کے فضائل و کمالات سب سے جداگانہ انداز میں بصیرت افروز اور حقائق آمیز نہ ہوئے، محاسن و مکارم عمل کا کون سا میدان ہے جس میں انھوں نے چھیالیس برس تک علم بردار کی عظمت و شان کے ساتھ جہاد کی دعوتیں نہ دیں؟؟ کیا کہا جاسکتا ہے کہ کتنی مختلف النوع زندگیاں ایک وجود میں سمٹ آئی تھیں؟ کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کا جو پہلو سامنے آجاتا تھا، وہ یگانگی و یکتائی میں سراسر حیرت افزا نہیں ہوتا تھا؟ ایسی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ کہاں سے لائی جائیں، اور اپنے ما فی الضمیر کو مناسب سلیقے سے کیونکر معرض تحریر تک پہنچائیں[1]"

یہ معذرت مولانا غلام رسول مہر (مرحوم) کی معذرت نہیں، میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اس معذرت نامہ سے اس لئے کیا ہے، کہ مولانا کے متعلق کچھ لکھنے سے قبل یہ سوچنا پڑتا ہے کہ اپنی بات کہاں سے شروع کی جائے، اور اس کے لئے مہر صاحب کے لفظوں میں "کون سا پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے" میرے سامنے مولانا بھی ہیں اور مولانا کا فضل و کمال بھی۔ مگر جب ہم ان کے فضل و کمال پر نظر ڈالتے ہیں، تو ایک نابغہ عصر اور مجمع البحرین سامنے آتا ہے کہ جس کی عظمتوں کا محاصرہ ناممکن ہے۔

---

[1] مولانا آزاد کی شخصیت کی چند جھلکیاں۔ ماہ نامہ جامعہ دہلی (مولانا ابوالکلام آزاد نمبر)

... میں، اکاڈمی کی پہلی پیش کش " ابوالکلام آزاد ــــــ احوال وآثار" کے نام سے عزیزی مسعود الحسن عثمانی کی حسن و ترتیب کے ساتھ پیش کی جا چکی ہے ۔ جس کی رسم اجرا، مفکر ملت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھوں سے ۱۰ ر نومبر ۱۹۷۷ء کو پرتبھا ہال لکھنؤ میں انجام پائی تھی ــ اب یہ دوسری پیش کش مولانا آزاد کے بیسویں سال وفات کے موقع پر شائع کی جا رہی ہے ، اس کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ تو اس کے مطالعہ سے لگایا جا سکتا ہے ؛ لیکن اس کے معیاری اور بلند پایہ ہونے کے لئے مولانا محمد یونس خالدی صاحب کا نام ضمانت ہے، وہ مولانا کے قدیم عقیدت مند ہی نہیں بلکہ انھوں نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا ہے ، اور علمی وادبی دُنیا میں ایک معروف شخصیت کے مالک ہیں ۔ اس کتاب کی ترتیب کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنا میرے لئے بے انتہا مشکل ہے ــ

آخر میں اکاڈمی کے صدر محترم مصطفےٰ حسین صاحب ایم ۔ ایل ۔ سی ، اور محترم سید غلام محی الدین صاحب اور دوسرے رفقاء کا شکریہ ادا کرنا بے انتہا ضروری ہے ، جن کے مفید مشوروں سے ہم ان کاموں کے انجام دینے کے قابل ہوسکے ، ہمیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی ان کے مشورے حاصل رہیں گے ، اور مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ ، اپنے منصوبوں کے پورا کرنے میں کامیاب ہوگی ۔

اے ، جے جلالی

سکریٹری مولانا آزاد میموریل اکاڈمی

لکھنؤ

۶- خصائص سلم
۷- اشتغال القرآن
۸- شرف جہاں قزوینی کے دیوان پر تبصرہ
۹- سیرت حضرت مجدد (شیخ احمدؒ سرہندی)
۱۰- اتحاف الخلف
۱۱- الکلم الطیب
۱۲- القول الثابت
۱۳- سیرت طیبہ ماخوذ از قرآن مجید
۱۴- سیرت امام احمدؒ بن حنبل، جس کے ساتھ ان کے نامہ ومیہ ؟ کی شرح بھی تھی۔
۱۵- سیرت امام ابن تیمیہؒ
۱۶- شرح حدیث غربت۔

اس فہرست میں صرف انھیں کتابوں کا ذکر ہے، جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۴ء تک دماغ سے نکل کر زبان قلم کی کرشمہ طرازیوں کی بدولت عالم ظہور میں آئی تھیں، اسی میں تذکرہ جلد دوم کو بھی شامل کر لیجئے۔ جو ابھی (ایاز) کے چاند کا انمول شاہکار ہے۔

اس فہرست میں مولانا کی ابتدائی دور کی تصنیفات اور تالیفات کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا ہے، کہ ان سب کی تکمیل پندرہ سولہ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ اور ان کے حصول کے بعد مولانا ان کے چھپنے کی اجازت بھی نہیں دے سکتے تھے۔ اسی جگہ یہ بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ قلعہ احمد نگر کے دورِ نظر بندی کی تصنیفات جہاں رہوں کا فقدان کے لئے منگوایا جاتا تھا، اور تمام وقت خامہ فرسائی میں صرف ہوتا تھا، اس دور کی یادگار "غبار خاطر" صرف "غبار خاطر"۔۔۔

مولانا کی زندگی کا اس سے بڑا المیہ اور کیا ہو سکتا ہے۔۔ لیکن ان کی زندگی کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی مختلف ادوار میں تقسیم کی جاتی رہی ہے، (حالانکہ مولانا کی زندگی ناقابل تقسیم ہے) اور ایک دور ایسا بھی آتا ہے، کہ ساری عمر کے ہم سفر بھی دھیرے دھیرے ان کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں، اور وہ اپنے ماحول میں "اجنبی" یا "غریب شہر" نظر آتے ہیں، اسی دوران ایک ایسا طبقہ ان کے قریب آتا ہے، جو جانتا جانتا تھا کہ مولانا بہت بڑے انسان، بہت بڑے عالم، بہت بڑے فلسفی، بہت بڑے ادیب، بہت بڑے صحافی، بہت بڑے سیاست داں، بے انتہا ذہین، کانگریس کے بہت بڑے لیڈر، اور بہت بڑی

آہ ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو وہ

"مجمع البحرین رخصت ہوگیا، اور اس کی جگہ لینے والا تو کیا پیدا ہو گا، ایسا بھی کوئی نہیں جو خود اس کی وسعت علم و نظر کا صحیح اندازہ پیش کر سکے"[1]

وہ اس دُنیا سے کیا رخصت ہوئے، کہ اپنے ساتھ فضائل و نفائس علوم کے وہ تمام ذخیرے بھی لیتے گئے، جو ان کے دل و دماغ میں جمع تھے۔ یہی نہیں

"بلکہ وہ ذخیرے بھی ناپید ہو گئے، جن کے متعلق یقین تھا کہ وہ دماغ سے نکل کر ترتیب و تسوید کی منزل میں پہنچ چکے ہیں لہذا انھیں محفوظ سمجھنا بے جا نہ تھا، اور ان کی فہرست کافی طویل تھی"[2]

جس میں ترجمان القرآن جلد سوم "تفسیر" "البیان" اور "مقدمہ تفسیر" کو خاص مقام حاصل ہے۔ یہ پے در پے تلاشیوں کا اندوہناک نتیجہ ہے۔ جس کی تفصیل ہیں" ترجمان القرآن جلد اول" الہلال دور دوم اور "البلاغ" سے معلوم ہوتی ہے۔ اس تباہی کا اثر مولانا کے دل و دماغ پر کچھ ایسا پڑا کہ مدت دراز تک وہ کچھ نہ لکھ سکے۔ "۱۹۲۷ء میں الہلال دور جدید کے اجراء کے ساتھ ساتھ از سر نو کام کا آغاز کیا، اور وہ برہم شدہ قافلہ اپنی منزل سے جا لگا، اس کے بعد تلاشیوں کا کوئی المیہ بھی نہیں پیش آیا، لیکن پھر بھی اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

ان بلند پایہ تصانیف کے علاوہ جن کتابوں کا ذکر مولانا کی تحریروں میں ملتا ہے، اس کی تفصیل، تفصیل کی محتاج ہے، اجمالی طور پر (مولانا مہر کی روح کو ایصال ثواب کے بعد) اس کی فہرست پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔ جو درج ذیل ہے:۔

۱۔ ایک مستقل رسالہ جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ از روئے قرآن، امم و ملل کے مراتب ہدایت و شقاوت کیا ہیں، اور یہ رسالہ ۱۹۱۲ء میں بغرض طباعت مطبع الہلال کے حوالے ہو چکا تھا۔
۲۔ سورۂ واقعہ کی تفسیر۔
۳۔ تاریخ معتزلہ
۴۔ سیرت شاہ ولی اللہؒ (محدث دہلوی)
۵۔ دیوان غالب اُردو پر تبصرہ۔

[1] ملفوظات مہر۔ مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی صفحہ ۹۸۔
[2] باقیات ترجمان القرآن مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؒ صفحہ ۱۔

کتاب التذکرہ اور "غبار خاطر" کی دیوناگری رسم خط میں اشاعت ان اداروں کے ناقابل فراموش کارنامے ہیں، لیکن یہ ادارے بھی اس طرح گوشۂ گمنامی میں چلے گئے، کہ آج ان کی تلاش بے سود ہے — مگر اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کہ ہندوستان کی یہ صدائے بازگشت پاکستان تک پہنچی، اور لاہور میں مولانا کے اسرار و معارف کی اشاعت کے لئے "ابوالکلام اکاڈمی" کا قیام عمل میں آیا، کراچی میں "آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" نے جنم لیا، ان دونوں اداروں نے ابتک جو خدمات انجام دی ہیں، اس کی تفصیل میں جانا میرے لئے بے انتہا مشکل ہے، اجمالی طور پر صرف "آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کراچی کے متعلق کہا جاسکتا ہے، کہ یہ ایک ذاتی، علمی و تحقیقی ادارہ ہے، اس کے بانی ارخ العزیز پروفیسر ابوسلمان شاہجہانپوری ہیں (جو ایک عرصہ تک اپنے نام کے ساتھ الہندی لکھتے رہے) اس ادارے نے مولانا پر اپنے کام کا آغاز "التبلیغ" سے کیا، اس کے بعد "امام الہند — تعبیر افکار" "مکاتیب ابوالکلام" "مولانا ابوالکلام آزاد ایک شخصیت"، "ایک مطالعہ" اور "ارمغان آزاد" کے نام سے معیاری اور بلند پایہ کتابیں شائع کیں،

"امام الہند — شخصیت اور کردار" "امام الہند (افکار)" "امام الہند (مقام)" "ابوالکلام آزاد و اقبال" "نقوش آزاد" "آزاد کا تنقیدی جائزہ" پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہیں۔ اس ادارہ کا ایک معیاری کتب خانہ بھی ہے — یہ یاد رہے کہ یہ ایک فرد کے کارنامے ہیں۔ افراد میں مولانا غلام رسول مہر، ڈاکٹر سید عبداللہ، عبداللہ بٹ، آغا شورش کاشمیری (مرحومین) کو کسی حال میں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، مہر صاحب کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا — شورش کاشمیری مرحوم نے مولانا آزاد کے بے شمار علمی نوادر جمع کئے تھے، اور ان کے رسائل و تصانیف بھی مہیا کی تھیں، یہی نہیں بلکہ انکی حیات، خدمات اور افکار پر فل اسکیپ سائز کے سات سو صفحات کی ایک معیاری کتاب بھی مکمل کر لی تھی، جسے آزاد اکاڈمی لاہور شائع کرنے والی تھی — نہیں کہا جاسکتا کہ اب وہ گوہر گرانمایہ کہاں ہے؟ اور کس کے پاس ہے؟ — لیکن مجھے اس کے عرض کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ جو کام وہاں افراد نے انجام دیا، یہاں جماعتیں بھی اس کام کو انجام نہ دے سکیں — یہی احساس تھا کہ جس کے پیش نظر ۱۹۷۵ء میں بلند حوصلوں کے ساتھ "مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ" کی تشکیل عمل میں آئی

اس کی تشکیل میں میرے عزیز دوست عبدالجبار جلالی صاحب، محترم اصطفےٰ حسین صاحب ایم۔ایل سی اور جناب آنند سروپ صاحب آئی۔اے۔ایس، کا نام سرفہرست ہے۔ جلالی صاحب مولانا کے عقیدت کیش ہی نہیں بلکہ مولانا آزاد میموریل اکاڈمی کے صاحب عزم سکریٹری بھی ہیں اور ان کے دل میں ایک ایسی تڑپ موجود ہے جس کا اظہار زبانِ قلم سے مشکل ہے، اس کا اندازہ ان کے عزم و استقلال

شخصیت کے مالک ہیں، ان کے نزدیک مولانا کی قدر و منزلت کے بس یہی پیمانے تھے، اور اسی آئینہ میں وہ مولانا کو دیکھتے تھے، لیکن جن لوگوں نے مولانا کو "الہلال" "البلاغ" "پیغام" "تذکرہ، جامع الشواہد، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب، قول فیصل، الہلال دور جدید، ترجمان القرآن، خطبات، مکاتیب، غبار خاطر، کاروان خیال، کے آئینہ میں دیکھا ہے، یا قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں، کہ ان کی عظمت کا اصل معیار کیا ہے! اور اس کا حق ادا کرنا کتنا مشکل ہے اور ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ

"وہ ہر دنیوی اعزاز و اکرام سے اس طرح بے نیاز تھے، گو یا یہ خس و خاشاک اس قابل ہی نہیں کہ اسے درخور اعتنا سمجھا جائے، یہ ریائی یا نمائشی بے نیازی نہیں، حقیقی پر خلوص بے نیازی تھی"[۵]

اسی بے نیازی کا یہ ادنیٰ کرشمہ تھا، کہ جس نے دوسروں کے لئے کیا کچھ نہیں کیا، لیکن وزیر تعلیم ہونے کے بعد بھی اپنی تصنیفات کی تکمیل و ترتیب کے لئے ایک پھوٹی کوڑی نہ چھوڑی ــــ

مجھے مولانا آزادؒ کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل رہی ہے، اور اس کے لکھنے میں بھی کوئی تامل نہیں، کہ جن عزیزوں سے خاص تعلق ہوتا تھا، اور وہ عمر میں بھی چھوٹے ہوتے تھے، انکو مولانا کی زبان قلم ہمیشہ "عزیزی" کے لقب سے یاد کرتی تھی، میں اس کو اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی یہ شرف حاصل رہا ہے ــــ یہی نہیں بلکہ مولانا نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی ہے، اور معیشت کی الجھنوں سے نجات دلائی ہے ــــ یہ مولانا کی زندگی کے وہ پرکشش پہلو تھے، کہ جس نے ۱۹۴۶ء میں مجھے اس بات پر آمادہ کیا، کہ "ابوالکلام اکاڈمی" کا قیام لکھنؤ میں عمل میں لایا جائے، اور اس آفتاب جہاں تاب کی درخشندگی کا، ملک سے اور آنے والی نسلوں سے تعارف کرایا جائے، لیکن انقلاب و حوادث کی نیرنگیوں کی بدولت ان کی عظمتوں کا حق نہ ادا ہو سکا ــــ ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا، ان کے وصال کے بعد ان کی زندگی، ان کے کارنامے، اور ان کے پیغام کو عام کرنے کے لئے ملک میں متعدد ادارے قائم ہوئے، ان اداروں میں (۱) ابوالکلام اکاڈمی پٹنہ (بہار) (۲) آزاد ایجوکیشنل ٹرسٹ۔ اورنگ آباد (۳) ابوالکلام آزاد اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد (۴) مولانا آزاد ایجوکیشن سوسائٹی، اورنگ آباد (۵) ابوالکلام اکاڈمی، جمشید پور (بہار) کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہے، ان اداروں نے ابتدا میں قابل قدر خدمات بھی انجام دیں، ہفت روزہ "الکلام، پٹنہ (بہار)" دور حیات کا آزاد نمبر" سہ ماہی علمی و ادبی مجلۃ غبار خاطر" مولانا ابوالکلام آزاد

[۵] افادات مہر صفحہ ۱۳۶

ندوۃ العلماء کے تاریخی اجلاس اپریل ۱۹۱۲ء کا ایک نادر مرقع

بائیں جانب سے کرسیوں پر:۔ (۱) منشی احتشام علیؒ (۲) مولانا حکیم سید عبدالحیؒ (۳) علامہ شبلی نعمانیؒ
(۴) علامہ رشید رضاؒ (۵) مولانا حبیب الرحمن خاں شروانیؒ اور دوسرے حضرات۔

بائیں جانب سے کھڑے ہوئے:۔ (۴) مولانا ابوالکلام آزادؒ (۵) مولانا سید سلیمان ندویؒ (۶) مولانا عبدالسلام ندویؒ اور دوسرے حضرات

(نسیم احمد صاحب مالک دانش محل، امین الدولہ پارک، لکھنؤ کے شکریہ کے ساتھ)

اور عملی جدوجہد سے لگایا جا سکتا ہے — اور آنند سروپ صاحب کو مولانا کے افکار و خیالات سے وابستگی ورثہ میں ملی ہے۔ انہی حضرات کی سعی، اور ان کے رفقاء کے تعاون سے ۲۰ر نومبر ۱۹۷۶ء کو اکاڈمی کی پہلی پیش کش "ابوالکلام آزاد احوال و آثار" نے مفکر ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھوں سے رسم اجرا کی منزلیں طے کیں۔ یہ کتاب مشاہیر ملک کے بلند پایہ مقالات کا مجموعہ ہے۔

اب یہ دوسری پیش کش "نقوش ابوالکلام آزاد" آپ کے سامنے ہے — یہ کتاب امام الہند مولانا آزاد کے متعلق ان ارباب فضل و کمال کے مقالات اور تقریروں کا مجموعہ ہے کہ جنہوں نے مولانا کو دیکھا، سمجھا اور پڑھا ہے، ان عدیم النظیر شخصیتوں کے متعلق یہاں اتنا ہی عرض کیا جا سکتا ہے، کہ وہ ہمارے تعارف سے بے نیاز ہیں، پھر بھی اجمالی طور پر تعارف کا جو صحیح موقعہ تھا، وہاں آپ ملاحظہ فرمائیں گے —

چلتے چلاتے پیش گفتار ختم کرتے ہوئے (مرحومین کا ذکر نہیں) میں ان تمام حضرات کا مشکور ہوں کہ جنہوں نے میری آواز پر لبیک کہا اور اپنے بلند پایہ رشحات قلم بھیج کر "نقوش ابوالکلام آزاد" کو اجاگر کرنے میں حصہ لیا۔ شکریہ

محمد یونس خالدی

۴ر فروری ۱۹۷۸ء

★

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

افکارِ عالیہ

مفکرِ ملت حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی یہ وہ تقریر ہے، جو مولانا نے رتبھا ہال لکھنؤ میں ۲۰ر نومبر ۱۹۸۸ء کو مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ کی پہلی پیش کش "ابوالکلام آزاد ـــ احوال و آثار" کے رسم اجراء کے موقعہ پر کی تھی ـــ یہ ایک بلند پایہ شخصیت کا حضرت امام الہندؒ کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت نہیں بلکہ ایک ایسی شہادت ہے، کہ جس سے بڑی شہادت اس دور میں ممکن نہ تھی۔
اس تقریر میں مولانا آزادؒ کی سیرت و کردار کا تعارف بھی ہے، اور زندگی کی گرم جوشیوں، ہنگامہ آفرینیوں کا تذکرہ بھی، ساتھ ہی ساتھ نسلِ انسانی کے لئے ایک روح پرور پیغام بھی ـــ
یہ تقریر محترم سید غلام محی الدین اور مولانا قمر علی ندوی کے شکریہ کے ساتھ آپ کے سامنے ہے ـــ (خالدی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

میں مولانا آزاد سے شخصی طور پر واقف ہونے کا شرف حاصل کر چکا ہوں، اور مجھے ان سے ایک طرح کا دیرینہ، نیازمندانہ اور عزیزانہ تعلق رہا ہے، میرا تعلق ان مضامین سے بھی رہا ہے جو طالب علمانہ سہی، لیکن بہرحال خوشہ چینی اور طالبعلمی اور مطالعہ کا جن سے مولانا آزاد کو شغف تھا، اور مولانا آزاد بعض چیزوں میں بڑے امتیاز اور اعزاز کا، اور بعض چیزوں میں شرکت اور رہنمائی کا منصب رکھتے تھے، میرا اس دانش گاہ سے بھی یا اس مکتبِ فکر سے بھی تعلق ہے، اور مجھے اس کی خدمت کا شرف حاصل ہے جس سے مولانا کو قلبی تعلق تھا، اور جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے بڑے محبوب دن گذارے ہیں، میری مراد ندوۃ العلماء سے ہے، یہاں مولانا نے "الندوۃ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے، شریک ادارہ کی حیثیت سے اپنی زندگی کے ایسے دن گذارے ہیں جو اپنے رقبہ اور اپنی مقدار کے لحاظ سے تو بہت زیادہ نہیں ہیں، لیکن اپنے جوہر کے لحاظ سے، اپنی قیمت کے لحاظ سے، اور زندگی کے اس عہد سے تعلق

کسی انسانی فرد پر جو نسل انسانی نے پیدا کیا ہو جس نے زندگی کی خدمت کے کسی میدان میں اپنی بڑائی ثابت کی ہو، اس پر فخر کرنے کا اس کو حق نہیں ہے، وہ دن دنیا کی تاریخ میں بڑا نامبارک ہوگا اور دنیا کی کوئی طاقت نہیں! میں نہیں سمجھتا کہ دنیا کا کوئی اقتدار اعلیٰ بھی انسانیت سے یا کسی انسانی نسل سے یہ حق چھین سکتا ہے، ہمارے ملک کو فخر ہے کہ اس نے ایک ایسے زمانہ میں جو عام طور پر انسانیت کے انحطاط کا زمانہ تھا اور جب ہندوستان کو اپنی ذہانت کے ثابت کرنے کے لئے، خودداری کے ثابت کرنے کے لئے اپنی خود اعتمادی کے ثابت کرنے کے لئے، اپنے حقائق پر یقین، غیر متزلزل یقین کو ثابت کرنے کے لئے، بڑی بڑی دشواریاں درپیش تھیں، اور کبھی اس کو دار و رسن کی منزلوں سے گذرنا پڑتا تھا، جیسا کہ اشارہ کیا گیا ہے، اور کبھی مصائب و محن کی منزلوں سے گذرنا پڑتا تھا۔ اس زمانہ میں ہمارے ملک کی سطح سے کچھ ایسے لوگ ابھرے کہ جو کوہ پیکر تھے، فلک پیما تھے اور جنھوں نے اپنی بڑائی کا نقش ثابت کر دیا۔

مولانا آزاد اس لئے بڑے نہیں ہیں کہ انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے جنگ آزادی کی رہنمائی کی (اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور ہم سب لوگ ان کے احسان مند رہیں گے)، بلکہ وہ اس لئے بڑے ہیں کہ انہوں نے اپنی بڑائی کو منوالیا، مخالفوں سے منوالیا، اور اپنے ہمنواؤں سے بھی منوالیا، انہوں نے اپنی ذہنی بڑائی کو اپنی دماغی بڑائی کو بھی تسلیم کروالیا، اپنی قادر الکلامی سے، اور نہ صرف اپنی تحریر کی روانی اور اپنے قلم کی جولانی سے، بلکہ اپنی فکری صلاحیت سے انہوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا دماغ عام سطح سے بہت اونچا ہے، اور خدا نے ان کو ذہانت کا ایک ایسا جوہر عطا فرمایا ہے، معاملہ فہمی کا، کسی مسئلہ کی تہ تک پہونچ جانے کا اور سب سے بڑھ کر دماغی توازن کا، جو ایک بہت بڑی نعمت ہوتی ہے، اور ذہانت سے زیادہ وہ کارآمد ہوتی ہے انسانیت کی تعمیر میں، اور علوم و افکار کی تحقیق اور ان کو آگے بڑھانے کے کام میں دماغی توازن کی، اصابت رائے کی ضرورت ہے، اور صحیح طریقہ پر دماغ سے کام لینے کی ضرورت ہے، جذبات کی رَو میں آدمی بہ نہ جائے اور جس چیز کا جو تناسب قدرت نے مقرر کر دیا ہے، اسی تناسب کے ساتھ اس سے معاملہ کرے، اس لحاظ سے مولانا آزاد نے اپنی بڑائی کا اور اپنی عظمت کا نقش قائم کر دیا، اور ہمارے لئے اور ہم آپ سب کے لئے یہ بڑے فخر و مسرت کا مقام ہے کہ ان کی یہ صلاحیت ضائع نہیں ہوئی، بلکہ ہندوستان کے اس آزمائش کے دور میں بھی اس سے پورا فائدہ اٹھایا گیا، اور گاندھی جی سے لے کر ایک معمولی شہری تک نے ان کی اس قابلیت کو اور ان کی اس خصوصیت کو تسلیم کیا۔

پھر دوسری بڑی خصوصیت ان کی یہ ہے کہ انہوں نے اپنا سودا نہیں کیا وہ دنیا کی اس نیلام کی

ر[illegible]ی بوجہ ، جو ہر شخص کو عزیز ہوتا ہے ، مولانا کی نگاہ میں بھی بہت عزیز تھے ، وقیع تھے اور جن کو انہوں نے کبھی فراموش نہیں کیا ،

حضرات! کسی ملک کی بڑائی کا امتیاز یہ نہیں ہے کہ اس ملک کا رقبہ بہت بڑا ہے یا اس ملک کی آبادی بہت زیادہ ہے ، ملک کی بڑائی کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس ملک میں بڑے آدمی کتنے پائے جاتے ہیں ، اس ملک نے کتنے بڑے آدمیوں کو جنم دیا ، پھر بڑے آدمیوں کا بھی معیار یہ نہیں ہے کہ وہ بہت دولتمند ہیں ، یا بڑے اختیارات کے مالک ہیں ، بڑے منصب پر فائز ہیں ، یہ سب چیزیں بھی خدا کی دین ہیں ، اور وہ بڑائی کی علامتیں ہیں ، بڑائی کا حقیقی معیار یہ ہے کہ اس کا دماغ کتنا بڑا ہے اس کا کیرکٹر کتنا پختہ ہے ، اگر کوئی ملک ایسے بڑے آدمیوں کی کوئی بڑی تعداد پیش نہیں کرسکتا ، تو جغرافیائی حیثیت سے بلکہ میں یہاں تک کہنے پر تیار ہوں کہ سیاسی حیثیت سے بھی ، اقتصادی حیثیت سے بھی ، سیاسی نقشہ میں اور اقوام متحدہ میں بھی اس کا کتنا ہی مقام ہو ، لیکن تاریخ میں ، انسانی فکر کی تاریخ میں ، اور انسانیت کے حقیقی میدان میں ، اس ملک کی بڑائی کچھ زیادہ تسلیم نہیں کی جائے گی اور وہ ملک کوئی ایسا نقش دوام نہیں چھوڑے گا دُنیا کے صحیفہ پر ، دنیا کی تاریخ پر کہ صدیوں تک باقی رہے ، ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک نے گذشتہ زمانے میں بھی خاصی تعداد میں ایسے بڑے آدمی پیدا کئے ، اور اس زمانہ میں بھی جب انگریزوں کا اقتدار اس ملک میں پورے طور پر قائم ہوگیا تھا اور یہ ملک عام طور پر زندگی کے تمام میدانوں میں بڑی آزمائش کے دور سے گذر رہا تھا ، جسے "قحط الرجال" کہتے ہیں وہ قحط الرجال کا شکار تھا ۔ انسانیت کا جو حقیقی میدان ہے اس میں بھی اس ملک کو بڑھنے ، پھیلنے ، پھولنے اپنی صلاحیت کو ظاہر کرنے کے مواقع بہت کم تھے ، اور اس کو برابر اس سے محروم کیا جاتا رہا تھا ، اس نے اس عہد میں بھی ایسے بڑے آدمی پیدا کئے جنھوں نے بڑا نام پیدا کیا اور صرف بڑا نام نہیں پیدا کیا بلکہ بڑا کام کیا ، بڑا کام انجام دیا اور اس ملک ہی کی تاریخ میں نہیں ، بلکہ فکر انسانی کی تاریخ میں ، اور علم انسانی کی تاریخ میں جو کسی ملک کا کوئی محدود سرمایہ نہیں ہے کسی ملک کا اس پر اجارہ نہیں ہے ، بلکہ انسانیت کی وہ دولت مشترکہ ہے ۔ اگر یہ تعبیر صحیح ہو ، دولت مشترکہ کے لفظ سے ذرا شبہ ہوتا ہے کچھ ڈر بھی معلوم ہوتا ہے اس کو کامن ولتھ کے مرادف نہ سمجھا جائے ، لیکن انسانیت کی ایک دولت مشترکہ ہے ، جس پر انسانیت کو ہر وقت فخر کرنے کا اور اس پر اپنا حق ثابت کرنے کا حق ہے ، اور یہ حق اس سے چھینا نہیں جاسکتا ، وہ دن بڑا منحوس ہوگا ، انسانیت کے حق میں وہ بڑا تاریک دور ہوگا ، جب انسانیت سے ، انسانی اقوام سے ، جماعتوں سے یہ حق چھین لیا جائے ، وہ کسی بڑے آدمی پر

لطف لینا جانتے ہوں تو آپ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس شخص کے لئے کیا مشکل بات تھی کہ سارے ہندوستان پر جادو کر دیتا اپنی زبان کا، اور پھر اس سے جو فوائد حاصل کر سکتا تھا وہ کرتا، مولانا آزاد نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی، وہ عقیدہ کے آدمی تھے، وہ مسلک کے آدمی تھے، وہ اصول کے آدمی تھے وہ جیسا کہ انہوں نے کہا، کسی سیاہ کپڑے کو کوئی پہن لے تو اُسے سفید نہیں کہا جاسکتا، اور اگر سفید کو کوئی سیاہ پوش یا کوئی سیاہ فام یا کوئی سیاہ آدمی استعمال کرے، اس سے فائدہ اُٹھائے، تو اسے سیاہ نہیں کہا جا سکتا، وہ حقائق پر یقین رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ انسان خدا کی امانت ہے، مقدس امانت ہے، ہمارا ملک اس لئے نہیں ہے کہ جہنم زار بن جائے اس لئے نہیں ہے کہ یہاں آدمی آدمی کے خون کا پیاسا ہو، یہ گاہکوں کا ملک نہیں ہے۔ یہاں ہر ایک خریدار ہے۔ ہر ایک گاہک ہے یہ ملک خریداروں کا اور گاہکوں کا نہیں ہے، خدا کی بستی کوئی دکان نہیں ہے، ان کا اس پر یقین تھا، یہ کوئی قمار خانہ نہیں ہے، یہاں جو پانسہ ڈال دے، جو پھینک دے کوئی چیز کوئی نقدی تو اس کو جیت لے، اور اس جوے خانہ سے وہ زیادہ سے زیادہ فائدہ لے کے نکلے، خدا نے اس کو اسلئے بنایا ہے کہ یہ بنے اور سنورے، اور پھلے اور پھولے، ہم پر اس ملک کا حق ہے انسانوں کو انہوں نے بچہ تسلیم نہیں کیا کہ ان کو بہلانا اور پھسلانا چاہتے ہیں، صاف کہتا ہوں مجھے یہ کہنے کا حق ہے کہ میں اس قوم کے ایک فرد کی حیثیت سے اس کی حقیقت سے واقف ہوں۔ انہوں نے اپنی قوم سے کوئی خراج تحسین حاصل کرنے، اور ان کا محبوب لیڈر ہونے کی کبھی قیمت ادا نہیں کی، انہوں نے کبھی یہ سودا نہیں کیا، کہ مسلمان مجھے اپنے سر پر بٹھائیں، اور اپنی آنکھوں میں جگہ دیں، میں ان کی خواہش اور ان کی منشاء کے مطابق بات کہوں، انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی، اپنی زندگی کے کسی دور میں اس کی پرواہ نہیں کی۔ لوگ کیا کہتے ہیں انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کا خدا ان سے کیا کہتا ہے، خدا کی کتاب آسمانی ان سے کیا کہتی ہے، جس کی انہوں نے خدمت کی، اور اس کی خدمت میں بھی انہوں نے بہت بڑا امتیاز حاصل کیا۔

مولانا آزاد کے دو جوہر تھے، ایک جوہر تو ایسا تھا کہ جو غیر اختیاری تھا۔ اور ایک جوہر وہ تھا جو اختیاری تھا، میں اس کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں، غیر اختیاری جوہر تو یہ تھا کہ خدا نے انکو ذہین پیدا کیا، وہ جب پیدا ہوئے تو ذہین پیدا ہوئے۔ وہ جینیس تھے، اگر ہمارے ملک میں دو چار آدمیوں کی ایسی فہرست پوری احتیاط سے بنائی جائے جس پر جینیس کا لفظ صحیح طور پر صادق آتا ہے اس لفظ کے استعمال میں بہت فیاضی سے کام لیا گیا ہے۔ اور بہت بے احتیاطی کی گئی ہے، میں

منڈی میں بہت دام اپنے لگوا سکتے تھے اور یہ دُنیا جو علم و فن کی دُنیا ہے ، جو علمی تحقیقات کی دُنیا ہے ،
جو قربانی کی دُنیا ہے جو آزمائشوں کی دُنیا ہے یہ آسانی کے ساتھ نیلام کی منڈی میں بھی مل جاتی ہے ہم نے
دیکھا ہے کہ مجبوری کی بنا پر ، یا اور دوسرے معلوم اور نامعلوم اسباب کی بنا پر بڑے بڑے انسان بھی
نیلام کی اس منڈی میں آجاتے ہیں ۔ وہ اپنا سودا کرتے ہیں ، وہ لوگوں کو موقع دیتے ہیں کہ ان کی
بولی بولی جائے ، مولانا آزاد اگر اپنی قیمت وصول کرنا چاہتے ، اپنی حکومت سے یا اس وقت کے
معاشرہ سے ، اس معاصر نسل سے ، کہ جو ان کا کلمہ پڑھ سکتی تھی ، ان کے پیچھے دیوانوں کی طرح ، شمع
کے پروانوں کی طرح ان پر نچھاور ہو سکتی تھی ، خدا نے ان کو خطابت کا جوہر دیا تھا اور ایسا جوہر دیا تھا ،
میں اپنی محدود معلومات کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں ، ہندوستان کے باہر شاید دُنیا کے کسی ملک نے ایسے
آتش نوا اور ایسے شعلہ بیان اور ایسے آتش ریز مقرر پیدا کئے ہوں ، یہ میں اس لئے نہیں کہتا کہ
مجھے اس مبارک تقریب میں اِس معزز تقریب میں شرکت کے لئے اور آپ کو خوش کرنے کے لئے کچھ
کہنا ہے ، بلکہ ایک شہادت کے طور پر ، ایک گواہی کے طور پر کہتا ہوں ، جیسا کہ اشارہ کیا گیا ، مجھے
ہندوستان سے باہر جانے کا اتفاق ہوا ہے ، دوسرے ملک دیکھے ہیں اور مجھے ان ملکوں کی ادبیات
سے بھی دلچسپی رہی ہے ، میں نے وہاں کے مقرروں کو سُنا ہے ، وہاں کی علمی مجلسوں میں میں نے ان کو
سُنا ہے ، اور عدالت کے کمروں میں میں نے ان کو سُنا ہے ، میں نے سیاسی رزم گاہوں میں بھی ان کو
دیکھا اور سُنا ہے ، اور اپنی اس واقفیت کی بنا پر فخر نہیں کرتا ، لیکن شہادت کی مضبوطی اور اس کے
استحکام کے لئے عرض کر رہا ہوں ، اگر کہا جائے کہ ہمارے اس دور نے اس بیسویں صدی نے اور اس
بیسویں صدی کے اس نصف اول نے دُنیا کے کسی ملک نے ایسے خطیب پیدا نہیں کئے ، یا یہ کہئے کہ
خاصی تعداد میں ، کسی قابل ذکر تعداد میں پیدا نہیں کئے جو مولانا آزاد کے ہم پلّہ ہو سکیں ، وہ شخص آگ
لگا سکتا تھا ، وہ شخص قوموں کو ، کم سے کم ہندوستان کی پبلک کو اپنے پیچھے دیوانوں کی طرح دوڑا سکتا
تھا ، وہ جس طرح ایک سیلاب آتا ہے ، پھر وہ بڑی بڑی چٹانوں کو بہا لے جاتا ہے ۔ وہ سیلاب
اتنا طاقت ور اور اتنا طوفانی تھا کہ بڑی سے بڑی چٹانوں کو بہا لے جا سکتا تھا ۔ مولانا آزاد کی یہ
ایک بہت بڑی قابل تعریف خصوصیت ہے جو کبھی ان کے حالات میں اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا
کہ انہوں نے کبھی اس کا غلط استعمال نہیں کیا ، وہ پورے ہندوستان کو اپنا مسحور بنا سکتے تھے ،
اسیر جادو کر سکتے تھے ، الہلال کے " سحر حلال " کو تو اب تک لوگ نہیں بھولے ہونگے آج بھی اس کی
سطروں میں وہ جادو ہے ، کہ آج بھی اگر آپ اس کو پڑھیں ، آپ کو زبان کا ذوق ہو اور آپ کچھ اس کا

اس کو پھر عدالت میں لایا گیا، اور اس کو وہ سزا دی گئی جو کلیسا نے اس کے لئے تجویز کی تھی، مولانا آزاد نے قرون وسطیٰ کے ایک دانشور، اور قرون وسطیٰ کے ایک محقق کی کہانی سنائی ہے، لیکن ساری عمر ان کا اسی کہانی پر عمل رہا، اسی کہانی کی اسپرٹ پر، اسی کہانی کے جوہر پر ان کا عمل رہا انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہیں کی کہ ان کے ہم مذہب کیا کہتے ہیں، کیا رائے قائم کرتے ہیں اور ان کے ہم وطن ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے ہیں، ہم کو اور آپ کو ہمیشہ اس بات کے آگے سر جھکا دینا پڑے گا، ان کی اس بڑائی کو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ ان کی ساری عمر صحیح بات کہنے، اور اسی پر اصرار کرنے میں گذری۔ اس کی ان کو وہ قیمت برداشت کرنی اور ادا کرنی پڑی جو ایسے سب حق پسندوں کو ادا کرنی پڑی ہے، وہ اس سے بڑے آدمی ہو سکتے تھے، اور جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق ہے اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ ان کو زندگی کی وہ بڑی سے بڑی آسائشیں حاصل ہو سکتی تھیں جو کسی محبوب لیڈر کو، یا کسی مذہب کے پیشوا کو حاصل ہو سکتی تھیں، لیکن انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہیں کی، وہ خواہ مذہبی عقائد ہوں خواہ سیاسی خیالات ہوں سیاسی عقائد ہوں، انہوں نے جس چیز کو صحیح سمجھا ہمیشہ ببانگ دہل اس چیز کا اعلان کیا، اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ اس کا کیا نتیجہ اور اس کا رد عمل کیا ہوگا، جب ہم اس موقع پر یہاں موجود ہیں تو ہمارا فرض صرف اتنا ہی نہیں ہونا چاہئے، کہ ہم مولانا آزاد کو خراج تحسین پیش کریں، نذرانۂ عقیدت پیش کریں، اب وہ تو اس عالم میں ہیں کہ ان کو وہاں ہمارے نذرانۂ عقیدت کی کوئی ضرورت نہیں اور جہاں اب ان کی تفسیری خدمت اور خدا کے ساتھ ان کا جو تعلق تھا جو ان کا عقیدۂ توحید تھا اور جو ان کے اخلاق تھے، ان کا کردار تھا۔ یہ ان کے مقام کو بلند کرنے کے لئے کافی ہے، ہم جب یہاں جمع ہوے ہیں اور خوش قسمتی سے کم سے کم ہماری ریاست اور اس سے زیادہ خوش قسمتی ہے کہ ریاست کے باہر، مرکز کے ایسے باوقار، اور ایسے صاحب کردار نمائندے موجود ہیں، تو ہم کو اس بات کو مولانا آزاد کے تذکرہ میں اس پہلو کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے، آج ہمارے ملک کو سب سے زیادہ انسانوں کی ضرورت ہے جو کسی صداقت پر، کسی سچائی پر اڑ جائیں، اور وہ اس کی بالکل پرواہ نہ کریں الکشن تو بالکل ادنیٰ درجہ کی چیز ہے، میں معذرت چاہتا ہوں، میں معافی چاہتا ہوں، لیکن کہتا ہوں کہ الکشن تو بالکل ابتدائی چیز ہے۔ الکشن سے بدرجہا زیادہ بلند چیزوں کی وہ پرواہ نہیں کرتے، اور اس کے لئے سب سے زیادہ انہیں جو انعام ملتا ہے، ان کا سب سے بڑا انعام یہ ہے کہ ان کا ضمیر مطمئن ہو، اور اس سے بڑا انعام یہ ہے کہ ان کا پیدا کرنے والا ان سے راضی ہو، اور خوش ہو، ہمارے ملک کا

سمجھتا ہوں اگر مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے۔ اس کروڑوں آدمیوں کے ملک میں جنیئس انسانوں کی تو میں پورے اعتماد اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مولانا آزاد کی جگہ اس میں محفوظ رہے گی، یہ تو غیر اختیاری چیز تھی، یہ خدا کی ایک نوازش تھی، اس کی دین تھی، کہ اس نے ان کو ایسا اونچا دماغ دیا تھا جو نیچا ہو نہیں سکتا تھا، اگر وہ چاہتے بھی کہ نیچی سطح پر اُتر آئیں تو وہ اتر نہیں سکتے تھے، ان کا دماغ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جس طرح کسی بڑی چیز کو آپ چھوٹی چیز میں محدود نہیں کر سکتے، خدا نے ان کو جو دماغ دیا تھا وہ کسی چھوٹے دائرہ میں محدود نہیں رہ سکتا تھا، اور اس کو نیچی سطح پر نہیں لایا جاسکتا تھا۔ وہ تو ایسے ہی پیدا ہوے تھے، ان کو دماغ ہی ایسا ملا تھا جو چیز ہمارے اور آپ کے خاص طور پر یاد رکھنے اور سبق لینے کی ہے، وہ یہ ہے کہ ایک اور ان میں جوہر تھا اور وہ یہ تھا کہ وہ ایک کیریکٹر کے انسان تھے، انھوں نے اپنی زندگی کا ایک مقصد معین کر لیا تھا کہ ان کو خدا کی مرضی کے مطابق کام کرنا ہے۔ اپنے مذہب کی ہدایت کے مطابق کام کرنا ہے، ان کا جن صداقتوں پر "انہی کی زبان میں بولتا ہوں" جن سچائیوں پر ان کا یقین جم گیا تھا ان سچائیوں کو پیش کرنا ہے، ان کو اس سے مطلب نہیں کہ لوگ خوش ہوتے ہیں یا ناخوش ہوتے ہیں، مجھے اس موقع پر بلا ارادہ انکی ایک تحریر کا ایک حصّہ یاد آگیا، غالبًا انہوں نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے کہ "گلیلیو" نے جب یہ دعویٰ کیا کہ زمین آفتاب کے گرد گروش کرتی ہے تو انہوں نے یہ واقعہ لکھا ہے، اور گویا حدیث دیگراں میں سر دلبراں بیان کیا ہے، اپنی آپ بیتی دوسروں کی زبان میں سُنائی ہے۔ جب وہ تحقیقی عدالت میں پیش کیا گیا جو کلیسا نے قائم کر دی تو اس کو بتایا گیا کہ اگر تم نے زمین کے مسطح ہونے اور یہ کہ سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے اگر تم نے یہ قبول نہیں کیا جو عیسائی عقیدہ ہے، حالانکہ یہ عیسائی عقیدہ نہ تھا، میں مذہب کے ایک ادنیٰ طالبعلم کی حیثیت سے پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ یہ نہ عیسائی عقیدہ ہے نہ اسلامی عقیدہ ہے، اور یہ کسی مذہب کا عقیدہ نہیں یہ مذہب کا موضوع نہیں ہے بلکہ اہل کلیسا کو اس پر اصرار تھا مقدس بائبل مقدس جاگرا فی اور بائبل کا جو مقدس جغرافیہ ہے ان لوگوں نے اپنی تفسیر میں لکھا تھا کہ یہ اس کا جز ہے اس کو عدالت میں لایا گیا اور اس کو بتایا گیا کہ اگر اس نے اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ زمین سطح ہے چپٹی ہے اور سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے تو اس کو زندہ جلا دیا جائے گا۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے وہ سہم گیا اور اس نے اقرار کر لیا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ عدالت سے نکلا تو اس نے کہا کہ میں تو اب بھی دیکھ رہا ہوں کہ زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے۔ میں اپنے اس مشاہدہ کو کیا کروں۔

کسی کو باغ سے محبت کا دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ ایک پھول کو برداشت کرے اور دوسرے پھول کو برداشت نہ کرے، جس کو خدا نے چمن سے محبت عطا کی ہے، اس کو تو وہاں کا تنکا بھی عزیز ہے، اس کو تو وہاں کا کانٹا بھی عزیز ہے، لیکن کانٹے تو کانٹے پھولوں کو چمن سے جدا کر دینا نہ ذوق جمال کی دلیل ہے، اور نہ حب الوطنی کی دلیل ہے، اسلئے جو آپ مولانا آزاد کا نام لیتے ہیں، تو آپ ان کے اس پیغام کو بھی یاد رکھیں اس کو زندہ رکھیں کہ انہوں نے اس ملک کو جو تصور دیا تھا، ان کے ذہن میں اس ملک کی جو تصویر تھی، وہ کیا تھی؟ وہ یہ تھی کہ یہ مختلف پھولوں کا چمن ہے، یہ ایک پھول کا نہیں ہے۔ یہ گیندے کے پھول کا صرف نہیں ہے، یہ کسی اور پھول کا صرف نہیں ہے، اس میں گلاب بھی ہے، اس میں بیلا بھی ہے، اس میں چنبیلی بھی ہے، اس میں نسترن بھی ہے، اس لئے ہم کو اگر اس چمن سے محبت ہے ہم کو خدا نے ذوق جمال، ہم کو پھول کی رعنائی و زیبائی کا کوئی تصور دیا ہے، اس لئے سب پھولوں کو اپنے سینہ سے لگائیں گے، اپنی آنکھوں سے لگائیں گے، اور اگر کوئی ان پھولوں میں سے کسی پھول کی طرف بُری نگاہ سے دیکھے گا، تو ہم اس کے دشمن ہوں گے، اگر ہم نے مولانا آزاد کے اس پیغام کو یاد نہیں رکھا تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہمیں ان کی روح کے آگے شرمندہ ہونا پڑے گا، وہ آپ سے اس بات کے بالکل طالب نہیں کہ آپ ان کے ادب کو خراج تحسین پیش کریں، بے نیاز ادیب، اپنے ادب کا ٹیکس وصول کرلیتا ہے، کوئی چاہے نہ چاہے لیکن اچھا شعر پڑھا جائے تو سب مجبور ہیں کہ اسکی داد دیں، مولانا آزاد ادب کے اُس مقام پر تھے کہ آج ان کو ہمارے ادیبوں۔ میں ان تحقیقی مقالوں کی تحقیر نہیں کرتا اور ناقدری نہیں کرتا، لیکن مولانا آزاد کو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم ان کو ایک صاحب اسلوب ادیب مانیں، ان کو اب اس کی ضرورت نہیں، کہ ہم ان کو ایک بڑے عالم کی حیثیت سے تسلیم کریں، ان کا لوہا مصر و شام بھی مانتے ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہے اگر ان کی روح کی کوئی پکار ہے ان کی روح کا کوئی پیغام ہے، اور میں کیا کروں کہ میرے کان اندر سے سُن رہے ہیں، کہ اس ملک کو بچاؤ، اس ملک کو خطرہ سے بچاؤ، اس ملک کو فسطائیت سے اور جارحیت سے بچاؤ، انسان دشمنی سے، طوفان سے اس ملک کو بچاؤ، علم دشمنی سے، حقیقت دشمنی سے، حسن دشمنی سے، کمال دشمنی سے بچاؤ، یہ اس ملک کے لئے حقیقی خطرہ ہے، اگر یہ خطرہ ہے۔ یہ خطرہ نہیں ٹلتا تو ہمیں پھر ضرورت ہے ایک آزاد نہیں چار سو آزاد پیدا ہوں،

حضرات! میں ان الفاظ کے ساتھ رسم اجراء کی اس خدمت کو انجام دیتا ہوں، اور میں اسے اپنے لئے بڑے فخر کی بات سمجھتا ہوں، کہ میں جب چند سال قبل مولانا آزاد سے ملنے میں فخر محسوس کرتا تھا

سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مولانا آزاد ایسے جو قیادت کا بانکپن رکھتے ہوں، جن کے اندر وہ حوصلہ مندی ہو، جن کے اندر پہاڑوں کی سی استقامت اور مضبوطی ہو، جن کے اندر دریا کی سی بے نیازی اور بے پروائی ہو، جن کے اندر روشنی کی سی فیاضی، اور فراخ دلی ہو، ایسے لوگوں کی ضرورت ہے ہمارے ملک کو، کہ اگر ملک کوئی غلط راہ اختیار کرتا ہے، میں نہیں کہتا کہ وہ غلط رُخ کیا ہے، یہ زندہ انسانوں کا ملک ہے یہ غور کرنے والوں یہ ان لوگوں ان انسانوں کا ملک ہے جو اپنے اندر خواہشات بھی رکھتے ہیں، اپنے اندر ترقی کی ہوس اور ترقی کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں، ہوسکتا ہے یہاں کچھ ایسی چیزیں جن میں ہمارے لئے کشش اور دل ربائی ہے، اگر کوئی ایسی چیز آجائے، اگر اس ملک کی کشتی اس بھنور سے نکال سکتا ہے، تو صرف وہ لوگ نکال سکتے ہیں، وہ سر پھرے ملاح نکال سکتے ہیں' جو طوفان سے لڑیں، اور ہمارے یہاں ہوا و ہوس کا، فرقہ پرستی کا، انسان دشمنی کا، حقائق فراموشی کا ایک طوفان، میں نہیں کہتا ایک چنگاری ہے جو سلگ رہی ہے اور اندیشہ ہے کہ اس خرمن کو کہیں جلا کر خاک سیاہ نہ کردے، آج ہم کو ایسے انسانوں کی ضرورت ہے جو اُٹھ کر کھڑے ہو جائیں اور کہیں کہ چاہے جان جائے اور چاہے دُنیا کی ساری آسائشوں سے ہم کو ہاتھ دھونا پڑے لیکن ہم اپنے ملک کو غلط راستہ پر، غلط راہ پر پڑا ہوا دیکھ نہیں سکتے۔

مولانا آزاد اس لئے بڑے نہیں تھے کہ وہ ذہین تھے بڑی اچھی تقریر کرتے تھے اور تحریک آزادی میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا، بلکہ وہ اس لئے بڑے تھے کہ انہوں نے اس کا مظاہرہ کیا، وہ بالکل اپنے ہم مذہبوں کے جذبات کی بھی اور ہم وطنوں کے جذبات کی بھی آندھی کے ساتھ اور طوفان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں تھے اور انہوں نے اپنی پوری زندگی میں اسی کا ثبوت دیا، اور اسی کا نقش وہ اپنی تحریروں میں اپنی کتابوں میں چھوڑ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مولانا آزاد کی [illegible] سے یہ تقریب ہو رہی ہے ہم ایک مرتبہ پھر اس سبق کو دہرائیں اور اپنے دل میں اس بات کا عہد کریں کہ اس ملک کو ان تمام خطروں سے بچانا ہے' جو سامنے آرہے ہیں، یہ ملک جیسا کہ مولانا آزاد نے ایک آدھ جگہ لکھا ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

انکا یہ عقیدہ تھا کہ یہ ملک مختلف پھولوں کا گلدستہ ہے، یہ مختلف تہذیبوں کا مختلف ثقافتوں کا مختلف کلچروں کا ایک مرکز ہے، اور اس کی خوبی اور اس کا حُسن اسی میں ہے کہ یہ پھول سب رہیں، اور

عزت مآب ہیم وتی نندن بھوگنا

مولانا ابوالکلام آزادؒ

ایک قد آور انسان

یہ عزت مآب ہیم وتی نندن بھوگنا (مرکزی وزیر) کی وہ تقریر ہے جو مولانا آزاد میموریل اکاڈمی لکھنؤ کی پہلی پیش کش "ابوالکلام آزاد — احوال و آثار" کے رسم اجراء کے موقعہ پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بصیرت افروز تقریر کے بعد کی تھی — اس تقریر کا ایک ایک حرف خلوص و محبت کا آئینہ دار ہے۔ تقریر میں مولانا آزادؒ کی بارگاہ عالی میں نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جن مسائل سے بحث کی ہے، وہ ہندوستان کے کتنے اہم اور الجھے ہوئے مسائل ہیں، جن کا سلجھانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں — اس کو بھوگنا جی ہی کا ایسا بالغ نظر انسان سلجھا سکتا ہے۔

تقریر کا پورا متن محترم سید غلام محی الدین کے شکریہ کے ساتھ قارئین کتاب کے سامنے ہے۔

(خالدی)

جناب صدر محترم علی میاں ندوی صاحب، عزت مآب گورنر صاحب، جناب رام پرکاش صاحب، خواتین اور حاضرین!

میں مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی کا انتہائی ممنون اور مشکور ہوں کہ انھوں نے مجھے موقع دیا کہ آج ایک لمبے قد کے انسان کے سلسلے میں جس نے ہمارے ہندوستان کی سرزمین کو اپنی پاک کلامی ہی سے نہیں بلکہ کاموں سے بھی نوازا ہے اس کی یاد کے سلسلے میں ایک دوسرے بیحد لمبے قد کے انسان، ایک دوسری ہستی ایک بہت وسیع دل و دماغ کے انسان، ایک بڑے بزرگ، جن کی موجودگی آج ہندوستان کے لئے باعث راحت ہے جن کے خیالات سُننے کا اور ان کی مبارک زبان سے اس بڑے انسان کے سلسلے سے براہ راست کچھ جاننے کا اور ہندوستان کے آج کے حالات پر اور اس کی تصویر میں رنگ بھرنے کے سلسلے میں جن لوگوں پر جو ذمہ داری عائد ہے ان کے لئے چند کلمۂ خیر ہی نہیں بلکہ مفصل مشورے بھی

ایک عزیز، عزیز خاندان کی حیثیت سے وہ مجھ سے محبت کرتے تھے، میں اس وقت بالکل نہیں سمجھتا تھا کہ کبھی اس قابل ہوں گا کہ ان کی زندگی کے بعد ایسی سنجیدہ اور باوقار مجلس میں شریک ہونگا، اور ایک ایسی کتاب کی رسم اجرا کروں گا جس کا انتساب ان کی گرامی ذات اور ان کی بلند پایہ ذات سے ہے، میں ان لوگوں کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے اہم خدمت کے لئے میرا انتخاب کیا، اور آپ کا بھی شکر گذار ہوں جنہوں نے پوری دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ اور میں جہاں تک سمجھتا ہوں دل کی رفاقت کے ساتھ، کانوں کی رفاقت نہیں، دل کی رفاقت کے ساتھ میری یہ حقیر گذارشیں سُنیں۔
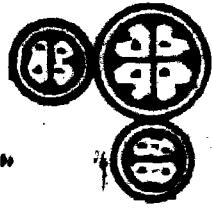
"تم نے ہمیشہ میری بات ٹھکرائی ہے، لیکن تم میری بات سے انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ میری بات سے انکار، حقیقت سے انکار ہے اور تم حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے، تم نے میری بات سے انکار کرکے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، حقیقت سے انکار کرکے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا میں جو کہتا ہوں سراسر حقیقت ہے، تم نے میری بات سے انکار کرکے اپنی اجتماعی عزت کو صدمہ پہونچایا ہے، حقیقت سے انکار کر کے کوئی شخص کسی طرح کی عزت حاصل نہیں کر سکتا، سُن رکھو کہ حقیقت میرے ساتھ ہے، حقیقت میری آواز ہے، اور وہ کسی طرح ٹھکرائی نہیں جا سکتی،

تم نے صبحِ شباب کی بات نہ سُنی، تم نے میرے دورِ جوانی کی نصیحت پر کان نہ لگایا، کیا اب شامِ زندگی کی بات بھی نہ مانو گے"

ابوالکلام[۱]

[۱] خطبہ عید الفطر (۱۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء آزاد میدان کلکتہ) کا ایک اہم اقتباس۔
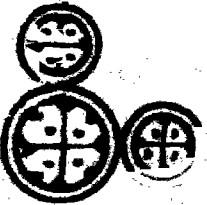
کاموں پر چل کر ہو سکتی ہے ان کے خیالات کے ساتھ ساتھ جڑ کر ہو سکتی ہے۔ مولانا کی یاد جیسا ابھی علی میاں صاحب نے کہا کہ اس ملک کی اصل صورت پہچاننے کی ضرورت ہے، یہ ملک جس میں بہت طرح کے لوگ ہیں۔ یہ ملک دریاؤں کا نہیں، یہ ملک پہاڑوں کا نہیں، یہ ملک انسانوں کا ملک ہے، عرصۂ دراز سے انسان اس ملک میں طرح طرح سے سوچتے رہے ہیں، طرح طرح سے کرتے رہے ہیں، طرح طرح کے طریقوں سے ڈھلتے چڑھتے اور آگے بڑھتے رہے ہیں۔ ہم ہمیشہ مل جُل کر آگے بڑھتے رہے۔ گنگا جمنا کے دھاروں کی طرح بلا کسی کو دبائے ہوئے ایک دوسرے کا ساتھ دے کر برابر آگے بڑھنے کی کوشش ہم نے کی ہے، ہمارا تمدن خوبصورت ہماری بھاشا ہماری زبان ملی جلی چیز ہے، میں بہت سے بھائیوں سے کہتا ہوں کہ زبان کے نام سے جھگڑا کرتے ہو اچھا نہیں لگتا کیونکہ اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کی سب سے پہلی زبان کون ہے، تو پھر کون زبان نکلے گی؟ وہ نکلے گی جس کو آج ہم کوئی بھی نہیں جانتے "پراکرت پالی" نکلے گی، لیکن زبان کا ایسا دریا بہتا رہا ہے اور اس طرح آتا اور جاتا رہا ہے ایک زبان نہیں رہی اور آج بھی ہمارے دیش میں کئی زبانیں ہیں مولانا آزاد کے سلسلے سے اُردو کی بات آتی ہے، اُردو ہندوستان کی ادبی دُنیا کی زبانوں کا سنگم ہے، چاہے عربی چاہے فارسی چاہے ہندوستان کی زبانوں کو ملا کر دیکھئے تو کئی زبانوں کے الفاظ اس میں ملتے جلتے آجاتے ہیں اور یہی ایک زبان ہے جس کا جنم ہندوستان کے اندر ہوا۔ اُردو لکھنؤ کی تہذیب اور اُترپردیش سے خاص رشتہ رکھتی ہے۔

ابھی آپ نے کہا کہ سرکار اُردو اکیڈیمی کو کم کرے یا زیادہ کرے،

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو برابر اور مسلسل لوگوں سے کہہ رہا ہے، اور ان لوگوں سے کہہ رہا ہے جو اُردو سے کچھ ڈرتے ہیں کہ اُردو سے جتنا ڈروگے اُردو اتنی ہی لمبی ہوتی جائے گی،

اس کی بیماری یہی ہے اور پہچان اس کی یہ ہے کہ ۴۷ء کے بعد جتنا ہم نے اُردو سے ہٹ کر دوسری طرف جانے کی کوشش کی ہم نے دیکھا کہ اُردو اتنی ہی زیادہ پھیلی ہے اس کے رسالے اتنے ہی نکلے ہیں، اس کے اخبارات اتنے ہی زیادہ نکلے ہیں، اس کی کتابیں اتنی ہی نکلی ہیں جتنا ۴۷ء سے پہلے نہیں نکلتے تھے۔ آپ دیکھئے صاحب قلم کوئی ہوں، کسی کا قلم ٹھہر جائے، کسی کا بڑھ جائے کسی کا تھم جائے لیکن اُردو نہ تھمتی ہے نہ رُکتی ہے وہ تو چلتی ہی چلتی ہے اس میں ہمت ہے اس میں زندگی ہے،

میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ سرکاری دفتروں میں اس میں کام ہونا چاہیئے اور سرکاری زبان بننا چاہیئے۔
اور اگر سرکار کہتی ہے کہ دو زبان کیسے ہوگی؟ تو سوئزرلینڈ کو لے لیجئے، اتنا چھوٹا ملک اور ایک سے

سننے کا جو موقع دیا ہے اس کے لئے میں اس اکیڈمی کے کارکنوں اور انتظامیہ کمیٹی کا بہت بہت شکر گذار ہوں۔ علی میاں صاحب ندوی کی مبارک زبان سے ان کے مقدس خیالات سے ہم سب کو زبردست فائدہ ہوا ہے۔

ان کی ذات سے اس ملک کو اس قوم کو دُنیا میں جگہ ملی ہے جیسے مولانا آزاد کی ذات اور شخصیت سے ہندوستان روشن ہوا تھا۔ مولانا علی میاں کی ذات سے آج روشن ہے، میں بہترین موقع سمجھتا ہوں کہ چاند اور ستاروں کی یاد چاند اور ستارے تو کر رہے ہیں مولانا علی میاں صاحب کی زبان سے مولانا آزاد کی بات سننے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔

مولانا آزاد کو بچپن میں دیکھا ــــ ان کا حُسن اخلاق، ان کا فکر و تدبّر، اس وقت میری گرفت سے باہر چیز تھی، لیکن ان میں ایک عجیب کشش تھی، آواز میں جادو تھا۔ بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھنجھوڑ کے ڈال رہا ہے، کوئی پکار رہا ہے، مردے کھڑے ہو جاؤ، زندگی تمھیں بُلا رہی ہے، بہت آگے جانا ہے، بہت دور جانا ہے، تھکنے کا کام نہیں، چلتے جانا ہے۔ ایک شاندار انسان جس کو اپنے اوپر بھروسہ تھا اس قوم کی قسمت پر بھروسہ تھا آنے والے زمانے میں بھروسہ تھا، مولانا علی میاں صاحب نے ابھی کہا، مولانا آزاد مرحوم وہ انسان نہیں ہیں جو ایک قوم، ایک ملک کی حد پر باندھے جا سکتے ہیں وہ انسان کی سوغات انسانیت کے لئے تھے، انسانیت کو فروغ دینے کے لئے۔ مولانا آزاد نے جنگ آزادی میں حصّہ لیا، اسی لئے میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اسلام نے آزادی کا پرچم اُٹھایا اور غلام انسانوں کو آزاد کرنے کے لئے اسلام وجود میں آیا تھا، چاہے خیالوں کی غلامی ہو چاہے کسی خاص قسم کے دور کی غلامی ہو اس سے باہر ہٹنے کے لئے اس سے بے چین اور زار زار انسانوں کی نئی دُنیا بنانے کے لئے اگر اسلام نے پکارا ہے انسانیت کو، تو اسلام کا ماننے والا غلام بن کر رہے یہ ممکن نہیں تھا، اس لئے ۱۸۵۷ء کے وقت ۱۸۵۷ء کی بغاوت جس کو میں غدر نہیں کہتا، ۱۸۵۷ء کی بغاوت رہی ہو یا سارے جنگ آزادی کی کہانی جب تک ہم آزاد نہیں ہوئے اور اس کا ایک حصہ آج بھی باقی ہے کہ جنگ آزادی راج بدل کی لڑائی نہیں تھی بلکہ سارے سماجی حالات کو بدلنا، ہماری کیفیت کو بدلنے کی لڑائی تھی وہ آج بھی جاری ہے۔ اس لڑائی کے کچھ پہلوؤں کی طرف علی میاں صاحب کی زبان سے ہم نے سُنا، میں اس کو دُہرانا نہیں چاہتا لیکن خطرے موجود ہیں اور ان خطروں کو ہم آپ کو سب کو برابر یاد رکھنا ہے تو اس جنگ آزادی کی جو صورت اور کوشش وجد وجہد کی جو صورت باقی ہے، اس میں آج بھی ہماری آپ کی سب کی شرکت مولانا کے لئے بہترین خراج عقیدت بن سکتی ہے، مولانا کی یاد لکھنؤ میں انہی کاموں سے کرنی ہے، ان کی یاد ان ہی

کسی زبان میں افسانے چھوٹی کہانیاں نہیں تھیں ، وہ تامل ناڈو والوں نے لکھیں اس سے پہلے کسی نے لکھی نہیں تھی اب ان کو گھمنڈ ہے کہ ہمارا ادب اتنا پرانا ہے آپ کیسے اس کو ختم کر دیجئے گا ، وہ کہتے ہیں کہ میاں تم لکھتے ہو تو ایسی ایسی لکیریں بنتی ہیں جیسے ڈنڈے بنتے ہیں ہم لکھتے ہیں تو پھول بنتے ہیں اگر غور کیجئے کوئی لکھے تو پھول بنیں کوئی لکھے تو ڈنڈے بنیں ۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تم پھول چھوڑ دو اور ڈنڈا پکڑو ، تو یہ سب جھگڑے غلط جھگڑے ہیں ،

اُردو کو مولانا آزاد جیسے لوگوں نے نوازا ہے ، مجھے توقع ہے کہ یہ اکیڈیمی کچھ کام کرے گی مولانا آزاد کی ذات ہر مشکل گھڑی میں ہمارا سہارا بن سکتی ہے ، جیسا کہ آج جناب محترم علی میاں صاحب نے اپنی باتوں سے نوازا ، ہمارا پورا خیال ہے کہ مولانا آزاد مرحوم ہٹ دھرم نہیں تھے لیکن اپنی باتوں کے دھنی تھے اپنی بات پر اٹل رہنے والے انسان تھے ۔

مولانا آزاد جینیس انسان تھے جیسا کہ مولانا علی میاں صاحب نے کہا ان کی آواز پرکشش تھی ، ان کا دماغ اعلیٰ درجہ کا تھا ، مجھے یاد ہے کہ ان کی تقریروں کا جادو سر پر چڑھ کے بولتا تھا ، ان کی ہر بات میں ایک وزن تھا ۔ سروجنی نائیڈو انگریزی میں اور مولانا اُردو میں تقریر کرتے تو معلوم ہوتا تھا کہ شاعری ہو رہی ہے ، جیسا کہ ابھی مولانا علی میاں صاحب نے کہا میں ڈر رہا تھا کہ ان کے بعد میں جاہل آدمی کیا کہوں گا ؟ کام تو سب ختم ہو گیا ہے لیکن پھر سمجھ میں آیا کہ بہت اونچے انسان کے بعد اگر کوئی چھوٹا انسان کھڑا ہو جائے تو سبھی لوگ سنتے ہیں کہ یہ کیا بولتا ہے ورنہ بات بگڑ جاتی ہے ۔

مولانا آزاد اپنی بات پر اٹل رہنے والے انسان تھے اس ملک کی تہذیب و تمدن ، اس ملک کی شرافت کا پورا مجسمہ اور نمایاں شخص تھے ، ان کی یاد میں تازگی پیدا ہوگی اور جب پیر لڑکھڑائیں گے تو ہمیں سہارا ملے گا ۔ اور مجھے بھروسہ ہے کہ اکیڈیمی کام کرے گی ، پیسے کی بابت ایک بات کہہ کر میں ختم کر دوں گا ، آپ نے پیسے کی بات ایسے انسان کے سامنے کی ہے جو ہمارے سامنے بیٹھے ہیں بار بار ان کا ذکر کرنا پڑتا ہے ۔ میں نے کیا غلطی کی کہ ایک مرتبہ ندوۃ العلما ، گیا اور میں نے دیکھا کہ ندوہ میں لائبریری میں ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ ہے ، یہ ذخیرہ ہمارے ہندوستان بلکہ انسانیت کا اُجاگر کرنے والا ہے ۔

میرے دل میں آیا کہ اگر ہر سال اس کے لئے کچھ پیسے دیئے جائیں تو اچھا ہوگا ۔ میں نے بجٹ میں رکھا کہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ ندوہ لائبریری کو دیا جائے جب یہ بجٹ پاس ہو گیا تو میں نے محکمۂ تعلیم میں وہ وہ خبر بھیج دی اور مولانا کو خط لکھا ، مولانا کا جوابی خط میری زندگی کی ر... سب بڑی چیز ہے ۔ وزارت اعلیٰ سے استعفا دینے کے بعد وہ خط میں نے فائل میں نہیں چھوڑا بلکہ ساتھ لیتا آیا اُس وقت میں منتری رام پرکاش جی

زیادہ زبانیں رائج ہیں۔

اُردو کو مٹانے کے معنی ہیں کہ لمبی تواریخ سے ناطہ توڑنا ہے، میں آج آپ سے کہتا ہوں میں آجکل "تیلی" ہوں تیلی کے ناطے سے تعلق پڑتا ہے عرب ممالک سے اور جب وہ بات کرتے ہیں عربی میں یا فارسی میں تو میں الفاظ پکڑ لیتا ہوں، میں نے مذاق کیا وہاں کے دوستوں سے میں نے کہا کہ میاں ہم تو وہ ہیں جو عربی کی فارسی سے شادی کراتے ہیں اور بچہ پیدا ہو جائے اُردو، کہنے لگے کیا مطلب ؟ میں نے کہا نعرہ لگاتے ہیں "انقلاب زندہ باد" عربی بھی موجود اور فارسی بھی موجود اور زبان و نعرہ ہمارا، یہ عربی اور فارسی سے جن کا تعلق نہیں ان کا بھی نعرہ ہے جو اُردو سے ہٹ کر دور رہنا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو اُردو پسند لوگ ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو قوم کو بنانا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، جو برباد کرنا چاہتے ہیں ان کا بھی نعرہ ہے، میرا ذہن بالکل صاف ہے اور میرا صاف کہنا ہے کہ یہ کیا اُردو کے معاملے میں کہ زیادہ بولنے والوں کو راضی کر لو تو ہم تمھاری بات مان لیں گے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کم تعداد میں ہے اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔؟

جمہوریت کے اصلی معنی یہ ہیں کہ جن کی تعداد کم ہے ان کا بھروسہ جمہوریت کے سلسلے سے موجودہ اقلیت کو ہے کہ نہیں ہے ؟ اقلیت اگر ساتھ نہیں ہے تو اکثریت کے ساتھ رہنا کوئی معنی نہیں ،

جب میں یہاں چند دنوں بدقسمتی سے چیف منسٹر رہا تو ایک صاحب نے اسمبلی میں کہا کہ جب سے آپ آئے ہیں اُردو بہت بولی جانے لگی ہے انھوں نے سوچا کہ وہ کچھ میرے خلاف بول رہے ہیں۔ تو میں جب بھی کوئی کام کرتا ہوں کسی سے پوچھ کر کرتا نہیں۔ میں جب وزیر اعلیٰ بنا تھا میں نے کہا تھا کہ اُردو کو اس کی جگہ دینی پڑے گی، اس کے لئے ہم کام کریں گے۔

ایک صاحب نے کہا تھا کہ "ہمیں اُردو سے کوئی جھگڑا نہیں اُردو کو ہم مانیں گے دیوناگری میں اُردو لکھنا شروع کر دو"، میں نے جواب دیا کہ آپ اگر اُردو کو کہتے ہیں کہ اپنی لکھاوٹ بدل دو تو ایک کام کیجئے اُردو والوں کے مشورے کے بغیر، مولانا علی میاں کے بلا اجازت کے، ان کی اجازت کے بغیر میں اکثر کام نہیں کرتا، کچھ غلطیاں جو کرتا ہوں وہ اپنے من سے کرتا ہوں لیکن اچھے کاموں کے سلسلے میں ان کو بتاتا رہتا ہوں کہ اگر کچھ اجازت ان کی ہو تو کیا جائے پھر اس میں کچھ غلطیاں بھی کم ہو جاتی ہیں ویسے میں ان کی اجازت کے بغیر اکثر کام نہیں کرتا، جواب یہ تھا کہ بنگالی کی، مراٹھی کی، گجراتی کی، ملیالم کی، تیلگو کی لکھاوٹ پہلے ناگری کر دیجئے اُردو والوں کی طرف سے میں ناگری لکھاوٹ کر دونگا دو دن پہلے تامل ناڈ میں تھا ان کو اپنی زبان، ثقافت و تہذیب پر ناز ہے، بات صحیح ہے۔ ہندوستان کی

ڈاکٹر ریاض الرحمن شروانی

مولانا ابوالکلام آزاد
مولانا غلام مہر کے
خطوط کے آئینے میں

ڈاکٹر ریاض الرحمن خاں شروانی عصر حاضر کی ان مشہور اور ممتاز شخصیتوں میں ہیں جو اپنے علوم و معارف سے ادب کی دنیا کو منور کرتے رہتے ہیں، مولانا ابوالکلام آزادؒ ان کا خاص موضوع ہے پھر مولانا سے عقیدت و محبت ان کو ورثہ میں ملی ہے، اس کے لئے اتنا ہی لکھنا کافی ہے، کہ یہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانیؒ کے پوتے ہیں، نواب صاحبؒ کے تعارف کے لئے صرف "غبار خاطر" کافی ہے۔

مولانا آزادؒ کے ساتھ ریاض صاحب کی عقیدت کسی خاص گوشے تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔ اور کسی سے ان کے تعلق کی بنیاد مولاناؒ سے عقیدت اور حسن عقیدت کے علاوہ کچھ نہیں ہے ــــ زیر نظر مقالہ اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے، اس مقالہ میں ایک ایسی شخصیت کے مکاتیب کو زیر بحث لایا گیا ہے، کہ جس نے ہند و پاک میں آزاد شناسی کے قواعد مرتب کئے، اور غلط فہمیوں کے بادل چھانٹے ــــ اس سے میری مراد مولانا غلام رسول مہر مرحوم سے ہے۔ وہ کیا تھے؟ کون تھے؟ مولانا آزادؒ سے ان کا کیا تعلق تھا؟ اس کے اظہار کا یہ موقع نہیں۔ لیکن ان تمام سوالوں کا جواب انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس مقالہ میں موجود ہے۔ (خالدی)

مولانا غلام رسول مہر مولانا ابوالکلام آزادؒ کے دور اول کے معتقدوں میں سے تھے۔ جب مولانا آزادؒ نے "حزب اللہ" قائم فرمائی تھی تو انہوں نے مولانا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور پنجاب میں ان کے نقیب وہی مقرر ہوئے تھے۔ مہر صاحب کا مولانا آزادؒ کے ساتھ عقیدت و احترام کا یہ رشتہ مدت العمر قائم رہا۔ لیکن ایک وقت ایسا آیا جب تمام ارادت و نیازمندی کے باوجود مہر صاحب کو مولانا آزادؒ کے ساتھ سیاسی معاملات میں اختلاف ہوا اور اس کا اظہار مہر صاحب نے "انقلاب" (جس کے وہ مولانا ...

کو بتا رہا ہوں کہ وہ پکڑ نہ لیں مجھ کو، اس خط میں مولانا نے مجھ کو لکھا لیکن انکار کا بھی کیا انداز ہے اور کیا اونچا ئی ہے کہا کہ "بھئی تمھاری محبت کا تو بہت شکریہ لیکن میری عادت خراب نہ کرو، تم رقم دے رہے ہو اس کے معنی یہ ہیں کہ ندوہ اپنے پیروں پر اور ایمان پر کھڑا نہیں رہے گا سرکار کے سہارے کھڑا رہے گا"

میری لمبی زندگی میں کوئی دوسری ایسی جماعت، کوئی دوسرا ایسا ادارہ اور کوئی دوسرا ایسا انسان نہیں ملا جس نے ملے ہوئے پیسے کو کہا ہو کہ آپ خدا کے لئے واپس لے جائیے، ہمیں نہیں چاہئے، میں حیرت میں آگیا، ایمان کی بات بتا رہا ہوں کہ مولانا نے یہ کیا کیا؟ یہی نہیں جب ندوہ میں بڑا جلسہ ہوا اور جس جلسے کا دُنیا میں بڑا چرچا ہوا۔ اس جلسے کے لئے میں پیچھے پڑ گیا کہ مولانا کچھ تو کرنے دیجئے۔ کچھ تو کرنے دیجئے وہ ہر بات میں "نا" کہتے رہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو "نا" کے سوائے کوئی لفظ آتا ہی نہیں۔

یہ بات بہت اونچی ہے میں اکیڈیمی والوں سے بھی کہنا چاہتا ہوں کہ انسان جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے تو دُنیا کو پھلانگ جاتا ہے اور رُکتا نہیں ہے۔ ندوۃ العلماء کی مجسم شکل آپ کے سامنے بیٹھی ہوئی ہے ۔ انہوں نے "نا" کیا باوجود اس کے کہ کچھ لوگ بہت ناراض ہوئے، اور جب ناراض ہوئے تو مجھ سے پوچھا گیا کہ وہ ناراض کیوں ہیں ۔؟ تو میں نے یہ شعر پیش کیا۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں

وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

میرا کہنا یہ ہے کہ مولانا نے یہاں بیٹھ کر آپ کو اور ہم کو یہ بتایا ہے کہ ہمت سے کام کرنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اکیڈیمی کام کرے گی ۔

مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر یہ مقدس جماعت اپنے پیروں پر کھڑی رہے گی اور وہ اپنے خیالوں پر اٹل رہے گی تو سرکار بھی مدد کرے گی، انسان بھی مدد کرے گا اور ملک بھی مدد کرے گا۔

قوم کو مولانا آزاد کی یاد کی بہت سخت ضرورت ہے اور جب میں قوم کہتا ہوں تو سارے ہندوستان کے سلسلے میں کہتا ہوں، میں دھرم کو اور قوم کو نہیں جوڑتا۔ ملک کو مولانا آزاد کی یاد کی ضرورت ہے، ان کے بتائے ہوئے طریقے کی ضرورت ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ ان کے راستے پر ہم چل سکیں گے اور وہی ان کے لئے سب سے بڑی یادگار ہوگی۔

عریضہ ارسال کیا۔ اس کا جواب مہر صاحب نے ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۲ء کو مرحمت فرمایا اور پھر خط و کتابت کا ایسا سلسلہ قائم ہوا جو مہر صاحب کی وفات (جو ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء کو ہوئی) سے ۲۵ روز قبل تک جاری رہا۔ میرے نام ان کے خطوط کی تعداد نوے کے قریب ہے اور آخری خط ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے تحریر فرمایا ہے: "دعا ہے ..... جب تک زندگی کے سانس باقی ہیں خیریت کی خبر کے پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔" آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ خدا نے ان کی یہ دعا کس طرح قبول فرمائی - ان کی وفات ۱۶ر نومبر کو ہوئی اور دسمبر ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے مسئلہ پر ہندوستان پاکستان کے درمیان وہ جنگ چھڑ گئی جس کے کارن دونوں ملکوں میں مہینوں تک رسل و رسائل ممکن نہیں رہا۔ مہر صاحب کے جو خطوط نسبتاً طویل ہیں ان میں مولانا آزاد کا ذکر بار بار اور مختلف انداز سے آیا ہے اور ان سے مولانا کی زندگی اور کمالات کے مختلف گوشوں پر بہت اچھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کے سب خطوط کے اقتباسات ایک مختصر مضمون میں نقل کرنا ممکن نہیں ہیں لیکن ذیل میں بعض ایسے اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جو زیادہ اہم ہیں اور جن سے ایک طرف مولانا آزاد کے ساتھ مہر صاحب کی عقیدت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف مولانا کے فضل و کمال کے بعض گوشے اجاگر ہوتے ہیں یا ان کی زندگی اور شخصیت پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اقتباسات نقل کرنے سے پہلے یہ اور عرض کر دوں (اور امید ہے کہ ایسا کرتے ہوئے میں مہر صاحب کی روح سے شرمندہ نہیں ہوں گا) کہ مارچ، اپریل ۱۹۶۸ء میں میرا لاہور جانا ہوا اور تین، چار مرتبہ مہر صاحب سے نیاز حاصل کرنے اور ان کے لطف و کرم سے بہرہ ور ہونے کی سعادت میسر آئی۔ ان ملاقاتوں کے دوران وہ غلط فہمی بھی رفع ہو گئی جو مولانا آزاد کے اور ان کے سیاسی اختلاف رائے کے بارے میں شروع سے تھی۔ مہر صاحب نے اپنے اس اختلاف کا اعتراف فرمایا لیکن ساتھ ہی اس امر کا اقرار کیا کہ "۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان وجود میں آیا اور ۱۵ر اگست کی صبح کو یہ انکشاف ہو گیا کہ سیاسی معاملے میں بھی وہی راستہ صحیح تھا جو مولانا نے اختیار فرمایا تھا۔"

اپنے پہلے خط میں مہر صاحب نے مولانا آزاد کے بارے میں لکھا: "مولانا اللہ تعالیٰ کے نشانوں میں سے ایک نشان تھے۔ انھوں نے زندگی کے بیشتر اوقات ہمارے درمیان گذارے۔ انتہائی عقیدت کے باوجود نہ ہم ان کی قدر و منزلت کا صحیح اندازہ کر سکے اور نہ حق نیاز ادا کر سکے۔ یہ مشہور شعر انھیں پر صادق آتا تھا:

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

عبدالمجید سالک کے ساتھ مدیر تھے) کے صفحات پر کیا۔ یہ بات میرے علم میں تھی اور چونکہ اپنا یہ حال تھا کہ مولانا آزادؒ کے ساتھ عقیدت کسی ایک میدان تک محدود نہیں تھی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھی اس لئے مواقع ملنے کے باوجود کبھی طبیعت مہر صاحب سے تعلقات استوار کرنے پر مائل نہیں ہوئی۔ تاآنکہ فروری ۱۹۵۸ء میں مولانا آزادؒ کی وفات ہوگئی اس کے بعد مہر صاحب نے مولانا کا حق رفاقت جس طرح ادا کرنا شروع کیا اس سے ان کی ذات میں کشش محسوس ہونے لگی۔ مہر صاحب نے مولانا سے متعلق مضامین ہی نہیں لکھے بلکہ "نقش آزاد" اور "تبرکات آزاد" کی صورت میں مولانا کے افادات بھی جمع کر دیئے۔ اور پھر ۱۹۶۱ء میں انھوں نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی میری نظر میں بہت وقعت ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مولانا آزادؒ کے قلم سے ترجمہ و تفسیر قرآن کا جو حصہ "ترجمان القرآن" کی شکل میں منظر عام پر آیا ہے وہ صرف سورۂ "المومنون" تک کا احاطہ کرتا ہے۔ بعد کے حصے کی زیارت سے دُنیا محروم ہی رہی اگرچہ اس کے قوی قرائن ہیں کہ یہ حصہ بھی مولانا کے ذہن سے نکل کر صفحات قرطاس تک منتقل ہوچکا تھا۔ پھر یہ حصہ زیور طباعت سے آراستہ ہوکر شائقین علم اور تشنگان معرفت تک کیوں نہیں پہونچ سکا یہ ایک نہایت الم انگیز اور اندوہ ناک داستان ہے جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ بہرحال جب مہر صاحب نے یہ محسوس فرمایا کہ اب اس حصے کے منظر عام پر آنے کا بظاہر کوئی امکان باقی نہیں رہا ہے تو انہوں نے "الہلال" "البلاغ" اور بعض دوسرے مقامات سے مولانا آزادؒ کی ایسی تحریریں جمع فرمائیں جن میں سورہ "نور" سے آخر قرآن تک مولانا نے قرآن کی مختلف آیتوں کا ترجمہ یا تشریح کی تھی اور انھیں "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے شائع کر دیا۔ جیسا کہ عرض کیا، میرے نزدیک یہ مہر صاحب کی مولانا آزادؒ کے سلسلے میں ایسی خدمت تھی جیسی خدمت کسی اور نے انجام نہیں دی تھی۔ یہاں ضمناً یہ عرض کر دینا بے محل نہیں ہوگا کہ اس کے بعد مہر صاحب نے دو اور اسی درجے کی خدمات انجام دیں۔ سیرت پاک اور دیگر انبیائے عظام سے متعلق مولانا آزادؒ کی جو تحریریں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں انھیں یک جا کرکے دو ضخیم مجلدات میں "رسول رحمت" اور "انبیائے کرام" کے زیر عنوان شائع کر دیا ہے اور ان میں جہاں جہاں خلا نظر آیا ہے اسے خود اپنے قلم سے پُر کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کا انھیں اجر عظیم عطا فرمائے گا۔

بات ذرا طویل ہوگئی، عرض کرنا یہ مقصود تھا کہ "باقیات ترجمان القرآن" کے مطالعے کا شرف مجھے ۱۹۶۲ء میں حاصل ہوا اور میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے مہر صاحب کی خدمت میں پہلی مرتبہ

صرف ایک مرتبہ ہی ۱۹۰۸ء میں تشریف۔ لے گئے تھے۔ مہر صاحب نے میرے اس خیال کی تائید فرمائی اور اس کے ثبوت میں سات نکات تحریر فرمائے جنھیں طوالت کے خوف سے نظر انداز کر رہا ہوں۔ آخر میں لکھا ہے: "بہرحال میرے نزدیک تو دو سفر بھی محلِ نظر ہیں، تین تو بالکل خارج از بحث ہیں۔ آپ ان معلومات کو شایانِ اعتماد تصور فرمائیں تو میرے ذکر کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آپ انھیں صرف اپنی معلومات کے طور پر لکھ سکتے ہیں"۔

۱۹ر فروری ۱۹۶۳ء کے خط میں میرے تبصرے (مطبوعہ "جامعہ" دہلی) کے حوالے سے تحریر فرمایا: "آپ نے بہت اچھا کیا کہ پورے شواہد پیش کر دیئے۔ نیازمندوں کا کام یہ تھا کہ مولانا کے متعلق مثبت چیزیں لکھتے مگر اب غلط بیانیوں کی تردید ہی میں وقت صرف ہو رہا ہے۔ کیا کیا جائے کہ نہ غلط بیانی پر سکوت کا حوصلہ اور نہ ساری دُنیا سے اعلان رزم و پیکار ممکن مگر جب تک سانس کی آمد و رفت جاری ہے اور ہوش و حواس مساعد ہیں خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔ حسب استطاعت کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہنا چاہیئے"۔

مولانا آزاد کی تاریخ ولادت پروفیسر ہمایوں کبیر (مرحوم) نے "انڈیا ونس فریڈم" میں خود مولانا کی روایت کے مطابق نومبر ۱۸۸۸ء لکھی ہے جب کہ مہر صاحب کی تحقیق اگست ۱۸۸۸ء کی تھی۔ اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "ایک بات اور صفائی سے عرض کر دوں؟ غیر معمولی حافظے کے باوجود سنین کے باب میں مولانا کے اکثر بیانات مجھے محکم معلوم نہ ہوئے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کی کہ اگر ۱۳۰۵ھ آپ کا سال ولادت ہے جیسا کہ "فیروز بخت" سے واضح ہے، تو ولادت زیادہ سے زیادہ ۴ر ستمبر ۱۸۸۸ء سے پیشتر کی ہونی چاہئے۔ یہ سُن کر وہ مضطرب ہوئے اور پوچھا تم نے تقویم وغیرہ دیکھ کر حساب لگایا ہے؟ عرض کی بیشک۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ نومبر ۱۸۸۸ء کی پیدائش کا بیان غالباً ہمایوں کبیر صاحب نے خود مولانا کی روایت سے اخذ کیا۔ مولانا پھر بھی مضطرب رہے۔ مگر آخر میں فرمایا کہ اگر تم نے تقویم وغیرہ دیکھ کر حساب لگا لیا ہے تو صحیح فیصلہ وہی ہوگا جو تمہارا ہے۔ غالباً اسی صحبت میں یا کسی دوسری صحبت میں تاریخ ولادت ۸ر یا ۹ر ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ بتائی یعنی ۱۷ر یا ۱۸ر اگست ۱۸۸۸ء"۔

سہ ماہی "العلم" کراچی کے کئی شماروں میں ایک صاحب کیپٹن محمد ایوب خاں کا ایک طویل مضمون مولانا کی تنقیص میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس کا ذکر اپنے کسی خط میں کیا تو جواباً ۲۱ر مارچ ۱۹۶۳ء کے خط میں لکھا: "العلم" کے بارے میں پہلی مرتبہ علم ہوا کہ اس میں برابر کچھ چھپتا رہا تھا اور آپ نے نیز ابوسلمان صاحب نے اس کا جواب بھی شائع کرایا۔ یہاں بعض اصحاب ایسے پہلے سے موجود تھے اور کچھ اصحاب باہر سے آگئے جن کے نزدیک مولانا کے خلاف لکھنا ایک نہایت اہم ملی و قومی کام ہے۔ یہ حلقہ پہلے

۲۸ جنوری ۱۹۶۳ء کے خط میں مولانا کا ذکر کئی عنوان سے آیا ہے " ترجمان القرآن" کی تیسری جلد کی گمشدگی کے سلسلے میں غالباً میں نے پروفیسر محمد اجمل خاں (مرحوم) کی نیت پر شبہے کا اظہار اپنے خط میں کیا ہوگا کیونکہ انھوں نے کسی موقع پر کہا تھا کہ تیسری جلد عالم وجود میں آئی ہی نہیں تھی۔ اس کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں "مولانا" کی عادت عمر بھر یہ رہی کہ جن اصحاب کو کسی معاملے میں کم ذوق پاتے تھے ان سے اس معاملے کے متعلق کوئی بات نہیں کرتے تھے، بس خاں صاحب کی موجودگی میں تو" غبار خاطر" چھپی۔ وہ "تذکرہ" کے ایک نسخے میں سفید اوراق لگواکر احمد نگر جیل میں مولانا کو دے آئے تھے کہ نظر ثانی کر دیں مگر بتاتے تھے کہ مولانا نے اسے اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس طرح کے تجربات کی بنا پر خاں صاحب کا تاثر یہ تھا کہ مولانا نے کچھ لکھا ہی نہیں۔ مجھ سے بھی انھوں نے بارہا ذکر کیا لیکن میں نے ان کے ذکر کو کبھی اہمیت نہ دی۔ وہ کچھ بھی سمجھتے اور کہتے ہوں، تاہم ان کے پاک دل اور پاک باطن ہونے میں کلام نہیں"

جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری (جو اس وقت اپنے نام کے ساتھ "الہندی" لکھتے تھے) کی کتاب "امام الہند" (تعمیر افکار) حال میں شائع ہوئی تھی اس پر تبصرہ کرنا چاہتا تھا اور مہر صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ مہر صاحب غالباً اس وقت تک ابوسلمان صاحب سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھے۔ ساتھ ہی مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی (مرحوم) کی تالیف "آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی" (جس سے ابوسلمان صاحب نے اپنی تصنیف میں خاص طور پر استفادہ کیا تھا) کے بارے میں مہر صاحب کی رائے تھی کہ اس کے اکثر بیانات قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ چنانچہ جواباً رقم طراز ہیں" ابوسلمان الہندی کی کتاب (امام الہند) پر ضرور تبصرہ لکھئے۔ میں تو پوری کتاب بالاستیعاب نہ پڑھ سکا کیونکہ عام اسلوب میں مولانا کے ذکر کی اہمیت و عظمت زائل ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مجھ ایسے شخص کا ذکر ہوا ہے۔ نیز ان صاحب کی زیادہ تر غلطیاں مولانا عبدالرزاق مرحوم کی کتاب پر مبنی ہیں۔ اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ غلطیوں کا اصل سرچشمہ وہی کتاب ہے۔ اب سوال یہ نہیں کہ مولانا نے وہ سب کچھ لکھوایا یا بتایا، سوال یہ ہے کہ مولانا ۱۹۲۱ء میں ان حالات کے لوازم و توابع سے ناآشنا نہیں ہو سکتے تھے اور پنجاب و بھوپال کے باب میں تاریخی غلطیاں محتاج تشریح و بیان نہیں۔ خدا جانے مولانا نے واقعات کس رنگ میں سنائے اور مولانا عبدالرزاق مرحوم نے کس انداز میں لکھ لئے" ابوسلمان صاحب نے اپنی کتاب میں مولانا آزاد کے تین بیرون ہند اسفار کا ذکر کیا تھا جب کہ میرا خیال تھا کہ مولانا اس زمانے میں ہندوستان سے باہر

اور خواجہ سنائی غالب سے پہلے کہہ گئے ہیں :

دور ہا باید کہ تا یک مرد حق پیدا شود بایزید اندر خراساں یا اویس اندر قرن

ہم لوگ "آدمیت" کی شناخت سے اتنے بے بہرہ ہو گئے کہ اقبال کو کہنا پڑا :

بہ آدمے نہ رسیدی ، خدا چہ می جوئی
زخود گریختۂ آشنا چہ می جوئی"

مولنا آزاد آخر عمر میں جس طرح کم آمیز اور گوشہ نشین ہو گئے تھے اس کے بارے میں لوگوں نے نہ جانے کیا کیا الزامات تراشے اور شکوک پیدا کئے ۔ مہر صاحب کا مولنا سے جو تعلق تھا اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے ، پھر بھی یہ کیفیت تھی کہ مہر صاحب اپنے ۲۰ر جولائی ۱۹۶۳ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں :" غالب نے ایک جگہ لکھا ہے :

پانی سے سگ گزیدہ جس طرح ڈرے اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

مولنا کو بھی آدمیوں سے اک گونہ ہراس سا پیدا ہو گیا تھا اور ملاقات سے پریشان ہوتے تھے ۔ ایک مرتبہ میں لاہور سے کوئی چار بجے کے قریب پہنچا ۔ غالبًا جمعہ کا دن تھا ۔ فرمایا ابھی مل لو ، پھر دو دن بات نہ ہو سکے گی ۔ ملا اور پھر میں نے ہفتے اور اتوار کا دن انتظار میں گذارا اگرچہ صرف ایک دیوار بیچ میں حائل تھی اور ملاقات نہ ہو سکی " مولانا کو ان کے ہم وطنوں اور ہم مذہبوں سے جو تکالیف پہنچی تھیں آدمیوں سے " یہ " ہراس " اُس کا قدرتی نتیجہ تھا ۔

ایک باب میں میرا مولنا غلام رسول مہر مرحوم سے اختلاف بھی رہا ۔ وہ " انڈیا ونس فریڈم " کو مولانا آزاد کی تصنیف قرار نہیں دیتے تھے جب کہ میری رائے اِس کے برعکس تھی ۔ اس بارے میں " صبح " دہلی میں میں نے ان سے تحریری طور پر جراءت اختلاف کی تھی اور غالبًا خطوط میں بھی تبادلۂ خیال ہوا تھا ۔ اسی ضمن میں ۲۹ر مارچ ۱۹۶۱ء کے خط میں انھوں نے اپنی رائے کے حق میں دلائل بہت تفصیل سے بیان فرمائے ہیں جن کی نقل طوالت کا موجب ہوگی اس لئے صرف ایک حصّہ درج کر رہا ہوں :" آپ نے محض نفس مطالب پر حصر کیا اور بظاہر مرزا غالب کا یہ مسلک پیش نظر رہا :

صورتے باید کہ باشد نغز و زیبا روزگار
گو بہ اکسونش بپوش و گو بہ دیبایش بپیچ

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ صورت کی زیبائی اور شانِ جمال غیر موزوں لباس سے بھی یقینًا متاثر ہوتی ہے خواہ تاثر کا درجہ کچھ ہو ۔ مولنا ان بزرگانِ روزگار میں سے تھے جن کے مطالب صرف انھیں کی زبان ،

خاصا سرگرم تھا۔ اب اس پر آہستہ آہستہ افسردگی طاری ہو رہی ہے۔ اس میں ایک حد تک سرگرمی مرحوم و مغفور ... .(یہاں ایک ایسے بزرگ کا نام درج تھا جن کا حوالہ دینا مناسب نہیں معلوم ہوتا) کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ مولاناؒ کے متعلق .... کے افکار و تصورات میرے لئے ہمیشہ معمار رہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چیزیں خود بخود ختم ہو جائیں گی بلکہ بڑی حد تک ختم ہو چکی ہیں۔ ہمارے لئے مثبت کا کام بہت زیادہ ہے اور یہی آرزو ہے کہ خدا اسے پورا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔" ۲۲ مئی ۱۹۶۳ء کے خط میں ان ہی ایوب خاں صاحب کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: "کپتان ایوب بالکل نیک دل اور سادہ لوح آدمی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ اکثر لوگ نیک نیتی سے ایسی باتیں ذہن میں بٹھا لیتے ہیں جو صحیح نہیں ہوتیں۔ دوسری کتاب اور شخص (یہ بزرگ بھی اب دُنیا میں موجود نہیں ہیں، اس لئے ان کے نام کا اظہار بھی مناسب نہیں ہے) کے باب میں کچھ کہوں تو ایک دفتر تیار ہو جائے۔ میرے پاس اس کے خطوط موجود ہیں جو بالکل دوسرا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ سب کچھ جس غرض سے لکھا گیا اس کا علم ہے۔ ہمارے عہد کی سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ معتقدات کو، خواہ وہ سیاسی ہوں یا دینی دوسرے مقاصد و اغراض کے تابع رکھا جا رہا ہے۔ یہ بیماری پہلے بھی موجود تھی مگر بہت کم۔ اب تو معلوم ہو رہا ہے کہ جنھیں ہم محکم و استوار چٹانیں سمجھتے تھے وہ بھی ریگ رواں کا ایک طلسم تھا اور بس لیکن کیا کیا جائے:

یک کاشکہ بود کہ بصد جا نوشتہ ایم

اور:

کامل اس فرقۂ زہاد سے اُٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے"

۲ جون ۱۹۶۳ء کے خط میں مولاناؒ سے متعلق اس طرح اظہار رائے فرمایا ہے: "یقیناً مولانا کا پیغام عمر بھر ایک رہا اور ۱۹۱۲ء سے تو اس کے لئے قطعی شواہد موجود ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں ان کے بعض ایسے مضامین جمع کرائے تھے جن میں قرآن حکیم کی مختلف آیات کی تفسیر بیان ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر واقعی تعجب ہوا کہ ۱۹۱۲ء میں جو کچھ فرمایا تھا وہ ان کے آخری دور کے ارشادات سے قطعاً متفاوت نہ تھا، محض عام مفہوم میں نہیں بلکہ جزئیات تک میں بھی کہیں اختلاف نظر نہ آیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ ۱۹۱۲ء میں اپنے عہد سے کس قدر آگے اور فکر و نظر میں کس درجہ بلند تھے۔ واقعی وہ ہمارے دور میں اللہ تعالیٰ کا ایک نشان تھے اور ایسے روشن نشانات کی بخشش کبھی عام نہیں ہوئی۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے:

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ   چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

دینا ضروری ہے، ایک خط ۱۱ر اپریل ۱۹۶۷ء کا ہے اور دوسرا ۶ر جون ۱۹۶۹ء کا۔ ۲۹ر مارچ ۶۷ء کے خط کے جواب میں غالباً میں نے لکھا تھا کہ "انڈیا ونس فریڈم" کو مولانا آزادؒ کی تصنیف۔ ۔ ماننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مولانا کے ساتھ عقیدت میں کمی ہے۔ اس کا جو جواب انھوں نے مرحمت فرمایا وہ ایک محبِّ صادق ہی لکھ سکتا ہے۔ فرماتے ہیں :" تعجب ہے میرے ایک عریضے سے آپ کے قلبِ صافی میں عجیب و غریب تاثرات پیدا ہوئے۔ کیا میں یہ سوچ سکتا ہوں کہ آپ کو مولاناؒ کی ذات سے میرے مقابلہ میں کم عقیدت ہے؟ نیز کیا آپ نے غالبؔ کا یہ شعر نہیں سُنا یا پیشِ نظر نہیں رکھا کہ :۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

اس سلسلے میں میں تو ساری دُنیا کو اپنے سے بڑھ کر مولاناؒ کا مُحب ماننے کے لئے ہزار مرتبہ تیار ہوں اور رات دن اس رقابت کے دائرے میں توسیع کی دُعا کرتا رہتا ہوں۔" "انڈیا ونس فریڈم" کے سلسلے میں بنیادی اختلاف یہی تھا کہ مہر صاحب اس کے اسلوب و طرزِ ادا کے پیشِ نظر اسے مولاناؒ کی تصنیف تسلیم کرنے میں متأمل تھے جب کہ میں اس میں بیان کردہ حقائق و واقعات کی بنیاد پر اسے مولاناؒ کی ہی تصنیف۔ قرار دیتا تھا۔

مہر صاحب آخر عمر میں کس طرح سیاسی مسائل میں بھی مولانا آزادؒ کے ہم خیال ہوگئے تھے اس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ۲۹ر مارچ ۱۹۶۷ء کے خط میں تقسیم ہند کے بارے میں مولاناؒ کے نقطۂ نگاہ کی اپنے خیال کے مطابق توضیح و تشریح فرمانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ رفعت حسینی صاحب جو جمشید پور کے رہنے والے ہیں، عرصے سے مولانا آزادؒ کے متعلق مضامین کا ایک مجموعہ مرتب کرکے شائع کرنا چاہتے ہیں لیکن بالوجوہ ابھی تک اِن کا ارادہ پورا نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں مہر صاحب سے بھی مضمون بھیجنے کی درخواست کی تھی اور غالباً مجھ سے بھی سفارش لکھوائی تھی۔ ۶ر جون ۱۹۶۶ء کے مکتوب گرامی میں اِس کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں :" مُرسل کا نام تو یاد نہیں۔ مُدّت ہوئی ایک خط آیا تھا کہ مولاناؒ پر سیاسی مضمون لکھ دو۔ میں نے معذرت کی تھی کہ وقت ان مباحث کے لئے سازگار نہیں جو سیاسی مضمون میں زیرِ تحریر آئیں گے۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان میں رہتے ہوئے مہر صاحب یا کسی دوسرے شخص کے لئے مولاناؒ کے سیاسی عقاید و نظریات پر منصفانہ طریقے سے قلم اُٹھانا ناممکن نہیں ہے اور اِسی لئے میرا قیاس ہے کہ وہ اپنا وہ ارادہ بھی پورا نہیں کر سکے ہوں گے جس کا اظہار ۲۹ر مارچ ۱۹۶۷ء کے خط میں فرمایا تھا۔

مہر صاحب مولانا آزادؒ پر کسی تنقید کے بارے میں کتنے حساس تھے اس کا اندازہ ۷ر مئی ۱۹۶۸ء

انھیں کے بیان اور انھیں کے اسلوب میں ٹھیک ٹھیک واضح ہو سکتے تھے اور موجودہ کتاب میں توان کے مطالب پر ترجمان مطالب کا رنگ اتنا گہرا نظر آتا ہے کہ اصل مطلب تک پہنچنے کے لئے کئی کئی پردے نظر کو چیرنے پڑتے ہیں۔ پھر حرفِ مطلب کی چنگاری لے کر اسے اپنے فکر و خیال سے شعلہ بنانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں: "مجھے آخری دور میں کئی سال تک مولینا کے مسلک (ظاہر ہے مراد سیاسی مسلک سے ہے) سے اختلاف رہا۔ اس لئے سمجھتا رہا کہ تقسیم کے باب میں ان کا نقطۂ نگاہ پیش کرنیکا مجھے کوئی حق نہیں۔ اب سب طرف سے خاموشی و سکوت دیکھ کر چاہتا ہوں کہ اس موضوع پر بھی ایک مفصل مضمون لکھ دوں جسے فی الحال چھاپنا تو دونوں ملکوں کے احوال پر اچھا اثر نہ ڈالے گا؟ تاہم اسے قلمبند تو ہوجانا چاہیئے، کل کون لکھے گا؟ یقیناً وہ سب کچھ مولانا کی زبان سے نہ ہوگا لیکن مجھے ان کے قلب و ذہن مبارک کا جو اندازہ ہے اس کے پیشِ نظر مدّت سے اسے سمجھے بیٹھا ہوں۔ یقین ہے کہ جب وہ لکھا جائے گا تو ہر صاحب نظر اتفاق کرے گا کہ واقعی مولانا کی دور رس اور عاقبت بین نگاہیں انھیں حقائق پر تھیں۔"

نہ معلوم یہ مضمون لکھا گیا یا نہیں، چھپا تو بہر حال نہیں ہے اور اندازہ یہی ہے کہ غالباً لکھا بھی نہیں گیا۔

ایک صاحب نے جو مولانا آزاد کے عقیدتمند سمجھے جاتے ہیں، مولانا پر ایک کتاب لکھی جس میں بعض ایسی روایتیں دہرادیں جو مولانا کے معاندین ان کے بارے میں اکثر بیان کرتے رہے ہیں۔ میں نے اس کتاب سے متعلق اپنے تاثرات مہر صاحب کو لکھ کر بھیجے تو ۶ر ستمبر ۱۹۶۰ء کے خط میں تحریر فرمایا۔

"کتاب کے متعلق آپ کا تاثر پہلے دن سے معلوم تھا..... میرا تاثر آپ کے تاثر سے زیادہ سخت ہے۔ میں سرے سے اس میں عقیدت کی آمیزش پاتا ہی نہیں مگر محض ریائے یا مصلحۃً۔ کتاب صریح خلاف ہے اور اس کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں جس کے متعلق سمجھا جائے کہ محرک تحریر عقیدت یا ایک جلیل القدر ہستی کے احوال کا غیر جانبدارانہ تجزیہ ہے..... تاہم مجھے یقین ہے کہ یہ تمام کوششیں ایسی ہیں جیسے برلب مرگ ہستی کو محرک دوائیں دے دے کر چند لمحوں کے لئے اس کی مہلت حیات بڑھائی جائے۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ نظیری کا یہ قول چار سو سال کے بعد امام ابن تیمیہؒ کے حق میں درست ثابت ہوا، مولاناؒ کے حق میں کیوں درست ثابت نہ ہوگا:

مشتری گو رد کن و دلّال گو دریا فگن
جنس گر خوب است خواہد کرد پیدا قیمتے

اور قرآن حکیم: واما ینفع الناس فیمکث فی الارض۔ نیز فاما الزبد فیذھب جفاءً۔"

۲۹ر مارچ ۱۹۶۰ء کے خط کے دو اقتباسات اوپر نقل ہوچکے ہیں۔ اسی ضمن میں دو اور خطوط کا حوالہ

محمد عتیق صدّیقی

قبال ور بولکلام★

عتیق صدیقی صاحب ایک بالغ نظر ادیب، انشا پرداز، اور محقق ہیں، وہ جس موضوع پر قلم اُٹھاتے ہیں، انتہائی جامعیت کے ساتھ اس کا حق بھی ادا کرتے ہیں، ان کی تصانیف علم و ادب کی دُنیا میں بے انتہا وقیع نظروں سے دیکھی جاتی ہیں، "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں" "۱۸۵۷ء کے اخبارات اور دستاویزات" "صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات اور مطبوعات" "گلکرسٹ اور اس کا عہد" "غالب اور ابوالکلام" کو خاص شہرت حاصل ہے۔ "آئینۂ ابوالکلام" ان کے حسن ترتیب کا آئینہ ہے۔ وہ فضل وکمال کے مجسّمہ، حُسن واخلاق اور شرافت کے پیکر، ہر دلعزیز اور ہمہ صفت موصوف انسان ہیں۔

عتیق صدیقی صاحب کا زیرِ نظر مقالہ بے انتہا جامعیت کا حامل ہے، اس کی افادیت کا اندازہ اس کے مطالعہ ہی سے لگایا جاسکتا ہے، اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ (خالدی)

بیسویں صدی کی پہلی چار دہائیوں میں اسلامی ہند کے علمی، ادبی، دینی اور سیاسی آسمان پر جو شخصیتیں آفتاب و مہتاب بن کر چمکیں ان کی فہرست تو خاصی طویل ہے، لیکن ان میں دو ہی شخصیتیں ایسی ہیں جن کی درخشندگی وتابانی آج بھی باقی ہے اور شاید طویل مدت تک باقی رہے گی ــ ایک ڈاکٹر سر محمد اقبال (۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۸ء) اور دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸ء تا ۱۹۵۸ء)۔ اقبالؔ کے شعری مجموعوں کو اور ابوالکلام آزاد کی تصانیف کو اس برصغیر میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ محتاج بیان نہیں۔

★ یہ مضمون مکمل ہونے کے بعد پریس کے حوالے کیا جاچکا تھا کہ نقوش، لاہور کے اقبال نمبر (۲) میں 'اقبال اور ابوالکلام' ہی کے عنوان سے قاضی افضل حق قریشی صاحب کا فاضلانہ مقالہ نظر آیا، جو بڑی محنت اور خلوص سے لکھا گیا ہے۔ عنوان اور بعض اقتباسات کے توارد کے باوجود دونوں مضامین کی نوعیت جداگانہ ہے۔ قاضی افضل حق صاحب نے اقبالؔ اور ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار سے بحث نہیں کی ہے۔

کے خط کی ایک عبارت سے ہوتا ہے۔ مالک رام صاحب نے "ساہتیہ اکاڈمی" کی طرف سے مولانا کی تصانیف "غبارِ خاطر"، "تذکرہ" اور "ترجمان القرآن" تہذیب و تعلیقات کے ساتھ شائع کی ہیں۔ پیش نظر مکتوب میں مہر صاحب نے "تذکرہ" کا جدید ایڈیشن پہنچنے کی اطلاع دی ہے اور ساتھ ہی لکھا ہے "عجیب امر یہ ہے کہ پہلے "غبارِ خاطر" کے ایک حاشیے کے متعلق میں نے سرسری سا اشارہ کیا۔ اس کا کوئی جواب نہ آیا۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں ناراض ہو گئے ہوں حالانکہ معاملہ بالکل معمولی تھا۔ مولانا نے جہاں بحر العلوم کی موسیقی کا ذکر کیا ہے وہاں میری یادداشت کے مطابق لکھا ہے کہ ان کے معاصرین نے اس فن میں مہارت کا ذکر کیا ہے۔ مالک رام صاحب نے فرمایا کہ بحر العلوم کی کسی کتاب یا ان کے سوانح میں کسی نے موسیقی کی مہارت کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے لکھا تھا کہ مولانا کا بیان معاصرین کی تصانیف کے متعلق ہے، نہ کہ بحر العلوم کی تصانیف یا سوانح کے متعلق۔ آپ نے اگر معاصرین کی تصانیف دیکھ لی تھیں تو جو چاہتے کہتے۔ اس طرح مولانا کے بیان کی تضعیف فرمائی مگر بالکل غیر صحیح طریق پر۔"

مہر صاحب نے مولانا آزاد پر بہت کچھ لکھا ہے جس سے مولانا کے متعلق مہر صاحب کے جذباتِ عقیدت و مودت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، اور مولانا کی زندگی اور کردار کے بعض گوشوں پر ایسی روشنی بھی پڑتی ہے جو بہت کم لوگوں کی تحریروں سے پڑ سکتی تھی۔ تاہم نجی خطوط میں بعض ایسی باتیں لکھی جاتی ہیں جو غالباً عام مضامین میں نہیں لکھی جا سکتیں۔ چونکہ میرا تعلق مہر صاحب سے مولانا آزاد ہی کے واسطے سے تھا، اس لئے میرے ساتھ مراسلت میں یہ موضوع بار بار آیا ہے۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا اس کی حیثیت مشتے از خروارے سے زیادہ نہیں ہے اگر کبھی مہر صاحب کے جملہ خطوط چھپوانے کی توفیق حاصل ہوئی تو اور بھی بہت کچھ واضح ہو سکے گا جو اس مختصر مضمون میں نہیں سما سکتا تھا۔

"انھوں نے اس سرزمین میں جو اب دو مملکتوں میں بٹی ہوئی ہے، علم و عمل کے ایسے درخشاں نقوش چھوڑے ہیں، جن کی مثال صدیوں میں بھی نہیں ملتی، اور آئندہ ایسی جامع اوصاف ہستی کا پیدا ہونا بھی مشکل نظر آتا ہے، یہ سب کچھ محض اس وجہ سے کالعدم نہیں ہو سکتا تھا (اور نہیں ہونا چاہیئے تھا) کہ ایک سیاسی معاملہ میں ان کی رائے وہ نہ تھی، جو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کی تھی، حالانکہ یہ معاملہ تا حال معرضِ امتحان میں ہے اور یہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کی عمومی بہتری کے نقطۂ نگاہ سے بہتر کون سی رائے تھی"

(مولانا) غلام رسول مہر (۳ر نومبر ۱۹۶۰ء)

تغیّر آگیا ایسا مزاج اہلِ عالم میں
کہ رخصت ہوگئی دُنیا سے کیفیت، وہ سیمابی
فغانِ نیم شب شاعر کی بار گوش ہوتی ہے
نہ ہو جب چشم محفل آشنائے لطف بے خوابی
کسی کا شعلۂ فریاد ہو ظلمت ربا کیونکر
گراں ہے شب پرستوں پر سحر کی آسماں تابی

★ ★ ★

صدا تربت سے آئی : شکوۂ اہلِ جہاں کم کن
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر مے خواں چو محمل را گراں بینی

یہ نظم البلاغ کے پہلے نمبر کے پہلے صفحے پر چھاپی گئی تھی۔ یہ عمل الہلال اور البلاغ دونوں کی روش کے برعکس تھا۔ ان دونوں اخباروں کے پہلے صفحے پر کوئی آیت قرآن یا کوئی اہم تصویر چھاپی جاتی تھی اور دونوں کا متعلقہ شمارے کے کسی اہم موضوع سے تعلق ہوتا تھا۔ اس انحراف کے اسباب کو سمجھنے کے لئے البلاغ کے اجراء کا پس منظر بیان کر دینا بھی ضروری ہے، جس سے نظم کی اہمیت بھی واضح ہوتی ہے۔

۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو الہلال کا اجراء ہوا۔ اس کے ابتدائی شماروں ہی نے اسلامی ہند میں ہلچل سی ڈال دی۔ حکومت نے بھی بڑی اندیشہ ناک نظروں سے اس ردّ عمل کو دیکھا۔ بالآخر چودہ مہینے بعد اس نے پہلا حملہ کر ہی دیا۔ اڈیٹر نے ناظرین کو اس کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا کہ الہلال پریس سے

"۱۸ر ستمبر کو دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی، جس میں ۲۷ر تاریخ تک داخل کرنے کی قید تھی، مگر آج ہی (کہ ۲۳ ویں تاریخ ہے) دو ہزار روپے کے گورنمنٹ ضمانتی کاغذات عدالت میں بھیج دیے گئے ہیں۔ ضمانت کا روپیہ تو اُسی تاریخ سے بطور امانت کے علٰحدہ رکھ دیا گیا تھا، جس دن الہلال پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریقِ عشق اول منزل [illegible]

۵۳ الہلال : جلد ۳ : نمبر ۱۳، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

اقبال شاعر تھے، فلسفی تھے، مفکر تھے، اسلام اور اس کی تاریخ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دس بارہ برسوں میں اسلامی ہند کی سیاست میں بھی انہوں نے نمایاں حصّہ لیا تھا۔
ابوالکلام آزاد، عالم دین، مفسّر قرآن، مدبّر اور قومی رہنما تھے۔ اپنی عمر کے کم از کم چھیالیس سال (۱۹۱۲ء تا ۱۹۵۸ء) انھوں نے دشت سیاست کی سیاحی میں گزارے تھے۔ ان دونوں کے ابتدائی افکار میں، یا یوں کہیے کہ بانگ درا کے اقبال اور الہلال کے ابوالکلام آزاد کے افکار میں، ایک گونہ یک جہتی نظر آتی ہے۔ اُس دور میں دونوں پان اسلامزم، یا اتحاد اسلامی کے پرجوش داعی تھے۔ بلقان اور طرابلس کی جنگوں نے اور پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں دولت عثمانیہ کے انتشار نے دونوں کو یکساں متاثر کیا تھا۔

۱۹۱۲ء میں الہلال کا اجرا ہوا تو اس نے اقبال کو اس حد تک گرویدہ کیا کہ اس کے لئے خریدار فراہم کرنے کی مہم میں انہوں[1] نے حصّہ لیا۔ ابوالکلام آزاد نے ان کی ایک نظم کو اپنے اخبار "البلاغ" کے پہلے صفحے پر شائع کر کے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا۔ نظم کا عنوان تھا "نوار اتلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی"۔ نظم یہ ہے۔

محل ایسا کیا تعمیر عرفی[2] کے تخیّل نے
تصدق جس پہ حیرت خانۂ سینا و فارابی
فضائے عشق پر تحریر کی اس نے نوا ایسی
میسر جس سے آنکھوں کو ہے اب تک اشکِ عنابی

★ ★ ★

میرے دل نے یہ اک دن اس کی تربت سے شکایت کی
نہیں ہنگامۂ عالم میں اب سامانِ بیتابی

[1] الہلال کے اجراء کے تین ماہ بعد اڈیٹر نے ان اصحاب کا شکریہ ادا کیا تھا جنھوں نے "بلا تحریک وطلب کے" اخبار کی توسیع واشاعت کی کوشش کی تھی۔ اس فہرست میں ڈاکٹر اقبال کا بھی نام تھا، جھنوں نے دس خریدار فراہم کئے تھے
(الہلال: جلد ۱ نمبر ۱۳: ۹ راکتوبر ۱۹۱۲ء)

[2] ۱۹۲۴ء میں جب بانگ درا شائع ہوئی تو یہی نظم۔ لفظی ترمیم کے ساتھ 'عرفی' کے عنوان سے شامل کی گئی۔ البلاغ میں اشعار کی جو تقسیم ستارے بنا کر کی گئی تھی، وہ بانگ درا میں نظر نہیں آتی۔

اور یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ملک کی علمی دُنیا سے دونوں کو سر عبدالقادر ہی نے روشناس کرایا۔ "مخزن" کے پہلے ہی شمارے (اپریل ۱۹۰۱ء) میں اقبال کی نظم "کوہ ہمالہ" کے نام سے شائع ہوئی۔ "یہیں سے گویا اقبال کی شاعری کا پبلک طور پر آغاز ہوا۔"[۵۷] اس کے سال بھر بعد ابوالکلام آزاد کا مضمون بھی مخزن (مئی ۱۹۰۲ء) میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا "فنِ اخبار نویسی"۔ اپریل ۱۹۴۷ء کے پہلے ہفتہ میں مرحوم سر عبدالقادر نے مولانا آزاد کی موجودگی میں راقم السطور سے فخریہ کہا تھا کہ "مولانا کا پہلا علمی مضمون میں نے ہی مخزن میں شائع کیا تھا۔" مولانا آزاد نے بھی اس کی تصدیق کی تھی۔

اقبال اور ابوالکلام آزاد کے تعلقات کی وسعت کا علم ہماری دسترس سے باہر ہے۔ لیکن یہ قطعی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ذاتی طور پر واقف تھے۔ اقبال کی وفات کو مولانا آزاد نے ایک "دیرینہ دوست کی جدائی" سے تعبیر کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ "جدید ہندوستان ان سے بڑا شاعر پیدا نہیں کر سکتا" نیز یہ کہ "ان کی فارسی شاعری بھی جدید فارسی ادب میں اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ ان کی وفات صرف ہندوستان ہی کا نہیں، پورے مشرق کا نقصان ہے۔"[۵۸] انہی کی وساطت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں ان کی:

"انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں ..... ڈاکٹر اقبال ..... سے پہلی دفعہ .... ملاقات ہوئی۔"[۵۹]

اس پہلی ملاقات سے قبل بھی ابوالکلام آزاد اقبال کی شاعری سے متعارف ہو چکے تھے۔ اسی طرح اقبال بھی غائبانہ ان سے ضرور متعارف رہے ہوں گے۔ خیال ہے کہ شیخ عبدالقادر نے اقبال سے ابوالکلام کا ذکر کیا ہوگا، جو غالباً ۱۹۰۱ء میں ان سے کلکتہ میں مل چکے تھے۔ اس سے قطع نظر "لسان الصدق" سے بھی اقبال بے خبر نہ رہے ہوں گے، جس کا نومبر ۱۹۰۳ء میں اجراء ہوا تھا، اور جسے ملک کے علمی حلقوں میں خوش دلی سے خوش آمدید کہا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ لسان الصدق کے نوعمر اڈیٹر سے مل کر اقبال پر بھی وہی استعجابی کیفیت طاری ہوئی ہو جس سے وحید الدین سلیم، مولانا حالی اور ابوالکلام کے دوسرے بزرگ معاصرین دوچار ہوئے تھے۔[۶۰]

---

۵۷ بانگ درا: ص ی

۵۸ پوئٹ آف دی ایسٹ۔ عبداللہ انور بیگ صفحہ ۹۵

۵۹ آزاد کی کہانی: ص ۳۲۳

۶۰ ایضاً: ص ۳۰۱

اس کے چودہ ہی ماہ بعد دوسرا حملہ کیا گیا، جو نسبتاً کاری ثابت ہوا۔ اڈیٹر اس وقت کلکتہ سے باہر تھے۔ سب اڈیٹر نے اخبار کے آخری صفحے پر "الہلال پریس کی ضمانت کی ضبطی" کی خبر سنائی!
"بنگال گورنمنٹ نے ۱۶ر نومبر ۱۹۱۴ء کو الہلال پریس کی دو ہزار کی پہلی ضمانت ضبط کر لی۔
سوئے اتفاق سے مولانا اس وقت دورے میں تھے۔ اور ان کی عدم موجودگی میں ضبطی و خانہ تلاشی کا وارنٹ آیا۔ دفتر کی طرف سے اس واقعے کی ان کو اطلاع دی گئی تو انہوں نے بذریعہ تار کے ہدایت فرمائی کہ جو نمبر چھپ رہا ہے فوراً شائع کر دو، اور ایک مختصر نوٹ میں ضبطی کی اطلاع کے ساتھ یہ اعلان کر دو کہ ہم اپنی ذات سے آخر وقت تک الہلال کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور انشاء اللہ جاری رکھیں گے۔"[۵۴]

سب اڈیٹر نے اسی نوٹ میں اگرچہ "الہلال کی آئندہ زندگی کی قارئین کو توقع" دلائی تھی، تاہم الہلال دور اول کا یہی آخری پرچہ تھا۔ الہلال کے پرستاروں کے لئے یہ سانحہ یقیناً جانکاہ ثابت ہوا ہوگا۔ گمان غالب ہے کہ اقبال کی یہ تضمین بھی اسی تاثر کی پیداوار رہی ہوگی، اور یہ انہوں نے ابوالکلام آزاد کو بھیجی بھی ہوگی۔ جب پورے ایک سال کے التوا کے بعد ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو الہلال کی جگہ پر البلاغ کا اجرا ہوا تو وہ اس کے پہلے شمارے کی زینت بنائی گئی۔ اس پس منظر کو سامنے رکھ کر اگر نظم پڑھی جائے تو صورت حال خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔

اقبال بہ اعتبار عمر ابوالکلام آزاد سے بارہ تیرہ سال بڑے تھے، تاہم دونوں کی قلمی زندگی کا آغاز ساتھ ہی ساتھ ہوا۔ "ابتدائی مشق کے دنوں کو چھوڑ کر اقبال کا اردو کلام بیسویں صدی کے آغاز سے کچھ پہلے شروع ہوتا ہے۔"[۵۵] ابوالکلام آزاد کی ابتدائی مشق کا بھی تقریباً یہی زمانہ ہے۔ وہ بھی "۱۸۹۹ء یا ۱۹۰۰ء میں شوقیہ کاغذ سیاہ" کرنے لگے تھے۔ "مگر کسی تحریر کو بغرض اشاعت بھیجنے کی جرات نہ ہوتی تھی۔" اس کے کچھ ہی دنوں بعد ایک ہفتہ وار اخبار "المصباح" کے وہ اڈیٹر بھی بن گئے۔ "لیکن یہ اخبار تین چار مہینے سے زیادہ نہ چل سکا۔"[۵۶] اقبال اور ابوالکلام کی قلمی شہرت کا بھی ایک ہی زمانہ ہے

[۵۴] الہلال: جلد ۵: نمبر ۲۰: ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء
[۵۵] بانگ درا: دیباچہ سر عبدالقادر: ص ۱۲
[۵۶] آزاد کی کہانی (پاکستان اڈیشن): ص ۷۱ - ۲۶۸

شوکت علی خاں، اور ہمارے قومی شاعر ڈاکٹر اقبال کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ ان دونوں اسلام پرستوں کو مذہب کی راہ اسی نے دکھلائی اور بتدریج اپنے رنگ میں رنگ دیا ......
ڈاکٹر اقبال کے مذہبی عقائد میں پچھلا حال جو کچھ رہا ہے، اس کے مقابلے میں اب ان کی فارسی مثنویاں دیکھتے ہیں تو سخت حیرت ہوتی ہے۔ اسرار خودی اور رموز بے خودی، فی الحقیقت الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں[۱۴۳]"

فضل الدین احمد کا یہ خیال، جو حقیقت پر مبنی نہیں تھا، قدرتی طور پر اقبال کو گراں گزرا۔ اس کا شکوہ بھی انھوں نے سید سلیمان ندوی ہی سے کیا۔ انھوں نے لکھا:

"مولانا ابوالکلام آزاد کا 'تذکرہ'، آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی صدائے بازگشت ہیں۔ شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں، ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں ..... اس بات کا مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا ..... میرے دل میں مولانا ابوالکلام آزاد کی بڑی عزت ہے اور اُن کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے ......
مجھے معلوم نہیں کہ مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں، ورنہ ...... یہ شکایت ان سے براہ راست کرتا۔ اگر آپ سے ان کی ملاقات ہو تو میری شکایت ان تک پہونچا دیجئے[۱۴۴]"

مولوی فضل الدین سے سید سلیمان ندوی کی ملاقات ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، لیکن اقبال کا شکوہ انھوں نے مولانا آزاد تک پہنچا دیا۔ اس کا مولانا آزاد سے اگرچہ براہ راست تعلق نہ تھا تاہم انھوں نے واضح الفاظ میں تسلیم کیا کہ:

"ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بے جا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی، اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی، لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے! دراصل اس کم بخت 'تذکرہ' کی ساری باتیں میرے لئے

---

[۱۴۳] تذکرہ: دیباچہ فضل الدین احمد، ص ۵ تا ز
[۱۴۴] اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ: ص ۱۱۱

پہلی ملاقات کے بعد اقبال اور ابوالکلام طویل مدت تک ایک دوسرے سے ملے یا نہیں؟ اس کا ہمارے پاس کوئی واضح جواب نہیں ہے، لیکن الہلال کے سلسلے میں جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں ان سے یہ نتیجہ تو اخذ ہی کیا جاسکتا ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے خبر یا لاتعلق نہیں رہے۔

اقبال اور ابوالکلام آزاد کے مکاتیب کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں شاید ان میں سے کسی میں بھی ایک دوسرے کے نام ان کے خطوط نہیں ملتے۔ لیکن اقبال کے بعض خطوط میں، جو انہوں نے سید سلیمان ندوی کو لکھے تھے، ایسے حوالے ملتے ہیں، جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ابوالکلام آزاد سے بھی ان کی خط و کتابت تھی، ۲۸ را پریل ۱۹۱۹ء کو سید سلیمان ندوی کو اقبال نے لکھا تھا:

"...... رموز بے خودی میں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی ..... آج مولانا آزاد کا خط آیا ہے۔ انھوں نے میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے[۵۱]"

یہ اس وقت کا قصہ ہے جب مولانا آزاد رانچی میں نظربندی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مندرجہ بالا اقتباس کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال نے خود ہی رموز بیخودی ان کو بھیجی تھی۔ انھوں نے اس کا ایک نسخہ مولانا محمد علی کو بھی بھیجا تھا[۵۲] اور وہ بھی اس وقت نظربند ہی تھے۔ "بہت پسند فرمایا ہے" سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا خط رسمی ہی نہیں رہا ہے بلکہ انھوں نے تفصیل سے اپنی رائے ظاہر کی ہوگی۔ اگر یہ تحریر محفوظ رہ گئی ہوتی، تو کام کی چیز ہوتی۔

۱۹۱۹ء کے اواخر میں، مولانا آزاد کی رہائی سے چند ماہ قبل 'تذکرہ' شائع ہوا۔ مصنف کے ایک دیرینہ دوست اور رفیق مولوی فضل الدین احمد نے اس کا مقدمہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ:

"الہلال کا سب سے بڑا کارنامہ جو ہمیشہ یادر ہے گا، وہ پائدار مذہبی انقلاب ہے جو یکایک مسلمانوں میں اس کی دعوۃ حق سے پیدا ہوگیا..... سب سے زیادہ یادگار اور تعجب انگیز اثر اس نے دو جماعتوں پر ڈالا..... یعنی علماء و مشائخ کا گروہ، اور انگریزی تعلیم یافتہ جماعت..... مثال کے طور پر ..... تعلیم یافتہ جماعت میں فدائے قوم مسٹر محمد علی اور

---

[۵۱] اقبال نامہ: مرتبہ شیخ عطاء اللہ: حصہ اول: ص ۸۰

[۵۲] محمد علی: مائی لائف صفحہ ۱۲۵

"بزرگوں کے معاملات ہیں، ناموروں کی باتیں ہیں، بڑوں کے مسائل ہیں، ایک خوردہ، ایک ذرۂ حقیر، خاکِ پا، ان جھگڑوں کی وجہ بیان کرے تو قصۂ دار و رسن نہ سہی، سنگِ خلائق کا نشانہ بننا تو ضروری ہے۔"[۱۸]

یہ جملہ سید عبداللہ کے قلم سے ارادی، یا غیر ارادی، طور پر نکلا ہے، اس کی غمازی کرتا ہے کہ اقبال اور ابوالکلام کی ایک دوسرے سے بے خبری و بیگانہ وشی کے اسباب سے وہ بے خبر نہیں ہیں لیکن مصلحت قلم گیر ہوتی ہے اور وہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ بہرکیف اقبال اور ابوالکلام کے ایک دوسرے سے بیگانہ رہنے کی عقدہ کشائی اس چھوٹے سے واقعے سے ہوتی ہے، جس کے راوی مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی مرحوم ہیں:

"مصری شاعر احمد شوقی پاشا کو عرب ملکوں نے 'امیرالشعراء' کا خطاب دیا تھا۔ اس پر مولانا (آزاد) کو خیال ہوا کہ ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کو 'ملک الشعراء' بنایا جائے۔ ایک دن صبح کو مولانا ہاتھ میں کچھ کاغذ لئے ہوئے میرے کمرے میں آئے اور اپنا خیال ظاہر کیا۔ میں نے سختی سے اس کی مخالفت کی۔ متعجب ہو کر فرمایا کہ کیا ڈاکٹر اقبال اس کے اہل نہیں ہیں؟ عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ کمالات کے مبصر آپ ہیں، مجھے شاعری سے ذوق نہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب محض شاعر ہی نہیں ہیں، سیاسی لیڈر بھی ہیں اور ہم ان کی سیاست کے مخالف ہیں۔ ملک الشعراء بن کر وہ سیاسی فائدہ بھی اُٹھا سکتے ہیں ......
یہ سُن کر مولانا نے ہاتھ کے کاغذ پھاڑ ڈالے اور فرمایا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں، ہمیں یہ تجویز پیش کرنی نہیں چاہیئے۔"[۱۹]

ملیح آبادی مرحوم نے یہ واقعہ پیغام کے ضمن میں قلم بند کیا ہے۔ پیغام شعلۂ مستعجل کی طرح ۲۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو نمودار ہوا تھا۔ میرا گمان ہے کہ یہ قصہ الہلال دورِ ثانی کا ہے، جس کا اجراء ۱۰ جون ۱۹۲۷ء کو ہوا تھا۔ ۱۹۲۱ء تک اقبال سیاست کے میدان سے الگ تھلگ رہے تھے۔ ۱۹۲۳ء میں انھیں سر کا خطاب ملا اور ۱۹۲۶ء میں وہ پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور یہی زمانہ ان کے سیاسی مشاغل کے آغاز کا ہے۔ اس بحث سے قطع نظر، مندرجہ بالا واقعہ اقبال اور ابوالکلام کے ذہنی اختلاف کی واضح نشان دہی کرتا ہے۔

---

۱۸ افکار و مسائل: ڈاکٹر سید عبداللہ: بحوالہ نقوش (لاہور) اقبال نمبر ۲: ص ۳۴۵
۱۹ ذکر آزاد: عبدالرزاق ملیح آبادی: ص ۳۱۲

تکلیف دہ ہوئیں ..... علاوہ ڈاکٹر اقبال والے ٹکڑے کے پورا مقدمہ طرز تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل لغو ہے"[۱۱]

یہ خط مولانا آزاد نے یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو لکھا تھا۔ اس خط میں تو اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا، لیکن ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ان کی رہائی کے احکام موصول ہو چکے تھے۔ اقبال نے یہ خبر سنی تو سید سلیمان ندوی کو لکھا:

"الحمد للہ مولانا آزاد کو آزادی ملی ...... اب کہاں ہیں؟ پتہ لکھئے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں"[۱۲]

اقبال اور ابوالکلام آزاد کے جو اقتباسات گزشتہ اوراق میں پیش کئے گئے ہیں اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھنے اور ایک دوسرے کے مقام سے واقف ہونے کے باوجود ان کے تعلقات میں گرمجوشی یا گہرائی نہیں تھی۔ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے مشترک پرستاروں کو اس کا دکھ ہے کہ ان دونوں میں مفاہمت نہ پیدا ہو سکی۔ اس مدرسۂ فکر کے سب سے بڑے نمائندے ڈاکٹر سید عبداللہ ہیں، انھوں نے ایک جگہ بڑی درد مندی کے ساتھ لکھا ہے کہ:

"بوعلی سینا اور شیخ ابوسعید ابوالخیر دونوں ہم عصر تھے۔ ان میں ذوق ونظر کا اختلاف تھا مگر جب دونوں کو ایک دوسرے پر اظہار رائے کا موقع ملا تو کتنے سلیقے سے ایک دوسرے کو دلاسا دے گئے۔ شیخ الرئیس نے لکھا 'انچہ او می بیند ما می دانیم'۔ اور ابوالخیر نے کہا 'انچہ او می داند ما می بینیم'۔ دونوں نے ایک دوسرے کا اعتراف کیا تو خاموش مفاہمت کی کتنی اچھی مثال قائم ہو گئی۔ مگر اقبال اور ابوالکلام ایک ہی دور میں رہ کر، اور بڑی حد تک ہم خیال ہو کر بھی باہم کتنے بے خبر رہے! اس پر تعجب سا ہے"[۱۳]

یہی شکوہ انھوں نے ایک اور جگہ واضح تر الفاظ میں کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ۔

[۱۱] تبرکات آزاد (پاکستان اڈیشن): ۱۵۷

[۱۲] اقبال نامہ: حصہ اول: ۱۰۱-۱۰۰

[۱۳] ابوالکلام —— امام عشق وجنوں: ماحول (کراچی) ابوالکلام آزاد نمبر: ص ۹۲ نیز آئینہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عتیق صدیقی: ص ۴۴-۴۳

حمیدہ سلطان

چند یادیں چند باتیں

"پیش نظر مقالہ مولانا ابو الکلام آزادؔ کی ان یادوں اور باتوں کا ایک انتہائی دلکش و دل آویز مرقع ہے جس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک جملہ اور ایک ایک سطر میں ایسے درخشاں نقوش نظر آتے ہیں جن کی مثال تلاش کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی۔

ان یادوں اور باتوں کا تعلق محترمہ حمیدہ سلطان صاحبہ کی ذات گرامی سے ہے، حمیدہ سلطان نے زبان و بیان کی خوبیوں کے ساتھ ان یادوں اور باتوں کو یکجا کر دیا ہے، اس مرقع میں مولانا کی شخصیت اور سیرت و کردار کے ایسے ایسے گوشے نظروں کے سامنے آتے ہیں کہ اگر محترمہ انھیں اجاگر نہ کرتیں تو وہ گوشے ہمیشہ کے لئے پردۂ خفا میں چلے جاتے، اور بے پناہ قدر و منزلت کے یہ پہلو منصۂ شہود پر نہ آتے، یہ سب ان کی اس وابستگی، اور خلوص و محبت کا ثمرہ ہے، جو ان کو مولانا کی شخصیت اور ذات سے ہے، زبان قلم سے اس کی عکاسی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھی۔

حمیدہ سلطان صاحبہ ایک معروف شخصیت کی مالک ہیں، وہ بلند پایہ ادیب او رانشا پرداز بھی ہیں، ان کی زبان دلّی کی ٹکسالی زبان ہے، انھوں نے مولاناؔ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کے مزید تعارف کے لئے اتنا ہی لکھنا بس کرتا ہے، کہ وہ محترم فخرالدین علی احمد (مرحوم) سابق صدر جمہوریہ ہند کی حقیقی چھوٹی بہن، اور نواب زین العابدین خاں عارفؔ کی پر پوتی ہیں۔ عارفؔ کا نام تاریخ میں اُس وقت تک زندہ رہے گا، جب تک مرزا غالبؔ اور غالبؔ کا کلام زندہ ہے — (خالدی)

جب مجھ سے خالدی صاحب نے حضرت مولانا ابو الکلام آزاد پر لکھنے کی فرمائش کی تو میں نے اپنے ماضی پر سے سالہاسال کی گرد کو جھاڑا۔ اور حافظے میں اُن دھندلے نقوش کو اُجاگر کیا جو میرے ذہن کا عزیز ترین سرمایہ ہے، مجھے اس پر فخر کرنے کا حق حاصل ہے کہ مولانا کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور جوں جوں میرا ذہن بالغ ہوتا گیا میں ان کا اثر قبول کرتی گئی۔ پہلی مرتبہ میں نے مولانا آزاد کو ۱۹۳۴ء میں کلکتہ بالی گنج کی دو منزلہ وسیع کوٹھی میں دیکھا تھا۔ میری والدہ بیگم آزاد کو

اقبال اور ابوالکلام کے سیاسی افکار کے نشوونما کا تقابل مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اُن دونوں کا سیاسی ذہن کبھی بھی ایک دوسرے کے ساتھ قدم ملا کر چل نہیں سکا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک اقبال کی فکر قوم پرستی سے سرشار تھی۔ اسی دور میں انھوں نے 'ہمالہ' 'ترانۂ ہندی' اور 'نیا شوالہ' جیسی قومی نظمیں لکھیں۔ جہاں تک ابوالکلام کا تعلق ہے "یہ سرسید مرحوم کی تقلید و اتباع کی سرمستی کا زمانہ تھا۔ طبیعت میں ان کی عقیدت پرستش کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ کوئی آواز جس میں ایک شائبۂ اختلاف یا تنقیص ہو، طبیعت کو گوارا نہ تھی"[۲۰]

۱۹۰۵ء کے بعد اقبال نے قوم پرستی کے عقیدے کو خیرباد کہا تو ابوالکلام آزاد نے سرسید پرستی کو ترک کر کے جارحانہ قوم پرستی کا مسلک اختیار کر کے دہشت پسند تحریک سے ناتا جوڑ لیا۔[۲۱] گویا اقبال اور ابوالکلام کا معاملہ یہ رہا کہ

'میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا'

اس کے بعد یہ دونوں بڑی استقامت کے ساتھ اپنے اپنے 'کفر' اور 'مسلمانی' پر قائم رہے۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریکیں شروع ہوئیں تو کم و بیش، چار سال کی نظر بندی سے رہا ہوتے ہی ابوالکلام آزاد اس آتش نمرود میں بے خطر کود پڑے، لیکن اقبال محو تماشائے لب بام ہی رہے۔ عین اسی زمانے میں انھوں نے سر کا خطاب قبول کیا، اگرچہ یہ وہ وقت تھا کہ خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں سے ہمدردی رکھنے والے سرکاری خطابات و اعزازات واپس کر رہے تھے۔ اقبال کے مداحوں کے لئے ان کا یہ اعزاز ایک بڑا سانحہ تھا۔ عبدالمجید سالک جو اقبال کے مداح ہی نہیں معتمد دوست بھی تھے، زمیندار (لاہور) کے مزاحیہ کالم 'افکار و حوادث' میں ایک نظم لکھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

لو مدرسۂ علم ہوا قصر حکومت ، افسوس کہ علامہ سے سر ہو گئے اقبال

کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

سودائے غم عشق سے سالک تو ہوا قید

اور خوبی قسمت ہے کہ سر ہو گئے اقبال

یہ واقعہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل کا ہے۔ اسکے بعد اقبال اور ابوالکلام کی سیاسی منزلیں واضح طور پر جدا ہو گئیں اور وہ دونوں اسلامی ہند کی سیاست کے دو ایسے دھارے بن گئے جو مسلمانانِ ہند کو دو متضاد سمتوں میں بہا لے جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے بوعلی سینا اور شیخ ابوسعید ابوالخیر کے ذوق نظر کے جس اختلاف کی طرف اشارہ کیا ہے وہ فروعی تھا، اس کے برعکس اقبال اور ابوالکلام کے ذوق و نظر کے اختلاف کی نوعیت بنیادی تھی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کے باب میں سکوت اختیار کرنا بھی ایک دوسرے کی عظمت کو تسلیم کرنے ہی کے مرادف ہے۔

[۲۰] آزاد کی کہانی: (لاہور ایڈیشن)؛ ص ۲۹۸

[۲۱] انڈیا ونس فریڈم صفحہ ۵

اس دن جیسا شگفتہ اور صحت مند میں نے مولانا کو کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کے سُرخ و سفید رنگ پر سیاہ رنگ کی اونچی ٹوپی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اور وہ بُلبل ہزار داستان کی مانند چہک رہے تھے۔ کبھی ارونا بھابی سے مذاق کرتے اور کبھی سروجنی نائیڈو پر پھبتی کستے۔ آصف علی صاحب سے سیاسی باتیں کرتے کرتے ادب کی جانب ان کی گفتگو کا رُخ ہوگیا تو مولانا نے ایک دو اُردو کے شعر پڑھے۔ ایک فارسی کا شعر بھی پڑھا مجھے یاد نہیں کہ وہ شعر کس کے تھے۔ بہرحال مولانا اُس دن بہت خوش تھے اور اُن کی بزلہ سنجی پورے عروج پر تھی۔ میز پر اُنھوں نے دِلّی کے کھانوں کی بابت گفتگو شروع کر دی۔ فرمانے لگے "قلعۂ معلّےٰ میں قورمے کو 'قُرداغ'، کہا جاتا تھا۔ امرائے دِلّی کے ہاں قورمہ" اور مولانا احمد سعید کی طرف دیکھ کر اُن پر فقرہ کسا" یہ مولوی اس کو سادہ سالن کہنے لگے"۔ اس کے بعد فرمایا" میرے والد پنڈت کے کوچے کے رہنے والے تھے اُن کا کہنا تھا" گنجے کی نہاری کھانے میں جو مزہ آتا ہے وہ کبھی کسی لذیذ سے لذیذ کھانے میں نہیں آیا۔ گنجا نہاری پکانے کا اُستاد تھا، پنڈت کے کوچے کے باہر نکڑ پر اُس کی دُکان تھی ہر رات نہاری کی دو دیگیں تیار کرتا تھا اور اس کی نہاری دلّی میں ایسی مشہور تھی کہ صبح سورج نکلتے نکلتے دونوں دیگیں ختم ہوجاتی تھیں۔

اس کے بعد اور کانگریسی لیڈروں کی طرح مولانا بھی کافی سال نظربند رہے اور میری ملاقات اُن سے دلّی کی ویرانی کے بعد ۱۹۴۸ء میں ہوئی میں مولانا صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ان پر ملک کی تقسیم کا ایسا اثر تھا کہ بالکل مغموم نظر آتے تھے اور اُن کی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی لیکن ہم بہنوں کے ساتھ اُن کی محبت و شفقت بدستور تھی۔ مجھ سے فرمانے لگے "عبداللہ سے کہو چائے لے آئے" چائے آئی تو اُس کے ساتھ اور لوازمات تو تھے چھوٹے چھوٹے سموسوں کی ایک قاب بھی تھی، مولانا نے ہم سب کی طرف سموسوں کی قاب بڑھائی میں نے آداب کر کے قاب اُن کے ہاتھ سے لے لی۔ چائے کے بعد میں نے کہا" مولانا صاحب! میں آپ سے معافی چاہتی ہوں آپ کی لائبریری کی تین کتابیں میرے ساتھ دلّی آگئی تھیں۔ ۱۹۴۷ء میں کوٹھی لٹی تو اُس کے ساتھ لائبریری بھی میری تباہ ہوئی۔ آپ کی کتابیں تلف ہوگئیں"۔

مُسکرا کر فرمایا" مجھے بھی کچھ کتابیں کم نظر آتی تھیں۔ آج اس کا راز کھلا" پھر کہا۔ یقیناً تم نے کوئی میرے رسالہ کی کتاب نہ لی ہوگی"۔

میں نے کہا" جی نہیں۔ ایک ناول تھا، ایک افسانوں کا مجموعہ اور ایک شہادت حسینؓ پر تاریخی کتاب تھی"۔

ملنے گئی تھیں۔ میں اُن دونوں بیویوں کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر اِدھر اُدھر گھومنے لگی۔ اور ہر کمرے میں جھانکا، پھرتے پھراتے زینے کے قریب مجھے کتابوں کی الماریوں سے بھرا کمرہ نظر آیا پڑھنے کا شوق مجھے ہمیشہ سے ہے، جھٹ کمرے میں گھس گئی۔ ابھی الماریوں کی جانب شوق بھری نظریں ڈال ہی رہی تھی کہ ایک الماری کے سامنے مجھے مولانا کھڑے نظر آ گئے۔ اُن کی پشت میری جانب تھی۔ اِس لئے میں واپس پلٹ کر والدہ کے پاس پہنچ گئی۔ ممانی زلیخا بیگم نے کہا: "کہاں گئی تھیں؟" میں نے کہا یونہی اِدھر اُدھر گھوم رہی تھی۔ مولانا صاحب کی لائبریری میں بھی گھس گئی تھی۔ وہاں وہ تشریف رکھتے ہیں" ممانی زلیخا بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا "ارے، تم وہاں سے کیوں آ گئیں، وہ تو تمہارے ماموں ہیں آؤ تم کو اُن سے ملوا دوں، پھر وہاں سے پڑھنے کے لئے اپنی پسند کی کتابیں بھی لے لینا"

میں اُن کے ہمراہ دھڑکتے دل سے گئی۔ مولانا صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے مطالعہ میں محو تھے، قدموں کی چاپ پر اُنھوں نے سر اُٹھا کر دیکھا، زلیخا ممانی نے کہا: "یہ ہیں بہن صاحبہ کی صاحبزادی حمیدہ سلطان ـــ ان کو آپ کی لائبریری دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" مولانا صاحب نے تمنتی بھرے لہجے میں کہا "آؤ بھائی! آؤ"

میں نے جُھک کر آداب کیا اور اُنہوں نے دُعا دے کر کہا "اگر تم کو کتب بینی کا شوق ہے تو اپنی پسند کی کتابیں یہاں سے لے لو"

میرے دل کی مراد بر آئی، جلدی جلدی دو تین کتابیں تاریخ اور ادب پر اُٹھا کر لے آئی، اِس کے بعد تو یہ دستور تھا کہ جب بھی جاتی بلا تکلف پڑھی ہوئی کتابیں رکھ کر اور کتابیں لے آتی، میرے ذہن کی تربیت کرنے میں مولانا آزاد کی لائبریری کا بڑا حصّہ ہے۔ اس وقت مجھ میں اتنا شعور کہاں تھا کہ مولانا آزاد کے پاس بیٹھ سکوں بس جب کبھی اُن کا سامنا ہو جاتا، آداب کر لیتی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہم لوگ دتّی واپس آ گئے۔ ۱۹۴۷ء میں آکا بھائی[لہ] کے ہمراہ آصف علی صاحب کے ہاں کھانے پر گئی تو مولانا صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ آکا بھائی نے کہا "یہ میری چھوٹی بہن ہے" مولانا آزاد نے مسکرا کر فرمایا "ہاں ہاں میں ان کو جانتا ہوں اور یہ آپ سے اتنی ملتی ہیں کہ آپ نہ بتاتے جب بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ آپ کی بہن ہیں"

لہ فخر الدین علی احمد مرحوم، سابق صدر جمہوریہ ہند۔

وہیں شادیاں کرکے پھنس گئے یہ لوگ کافی ذہین ہیں اور آسام میں فارسی پڑھیا "کے نام سے مشہور ہیں سر سعداللہ کا خاندان اور میرے والد کا خاندان انہی لوگوں میں سے ہے۔"

کھانے کی میز پر انواع و اقسام کے کھانے تھے لیکن مولانا صاحب کے سامنے صرف یخنی کا پیالہ رکھا تھا اور ایک سینکا ہوا توس۔ انہوں نے اس پر ہی اکتفا کیا اور فرمانے لگے: "تمام مسلم ممالک میں پلاؤ کی بہت اہمیت ہے پھر تاشقند کے پلاؤ کی خصوصیت بتائی، "کہ اس میں چاول کم اور گوشت زیادہ ہوتا ہے اور ایران میں تو بہت قسم کے پلاؤ تیار کئے جاتے ہیں۔ ایک سبز پلاؤ ہوتا ہے وہ مجھے بہت اچھا لگا۔"

کھانے کے دوران بار بار ہر کھانے کو لینے کی تاکید کرتے رہے، پڈنگ آئی تو انہوں نے بھی تھوڑی سی لے لی۔

ایک مرتبہ ہم تینوں پہنچے تو مولانا صاحب چینی چائے پی رہے تھے عبداللہ نے ہم تینوں کو بھی چائے کے فنجان پکڑا دیئے۔ میں نے اور خجستہ نے تو یہ چائے مزے لے لے کر پی مگر اختر نے ایک گھونٹ لیتے ہی منہ بنایا تو مولانا نے مسکرا کر فرمایا "ارے عبداللہ یہ لوگ تو وہی جوشاندہ پینے کے عادی ہیں، وہی لے آؤ، ان کے لئے ــــ یہ کیا جانیں اس چائے کے مزے کو۔"

مولانا آزاد تو بہت بڑے انسان تھے ان کو تو دلی کی بربادی کا دلی رنج تھا مگر میں بھی اس کی تباہی پر بہت افسردہ تھی۔ اور کوشش میں تھی کہ یہاں کی ادبی زندگی میں پھر حرکت ہو۔ اس لئے میں نے علامہ کیفی اور کنور مہندر سنگھ بیدی کے مشورے سے ۱۹۴۸ء نومبر میں اردو مجلس کی بنیاد ڈالی۔ اس کی نشستیں باقاعدہ پندرھویں دن ہارڈنگ لائبریری میں ہونے لگیں۔ علامہ کیفی باوجود پیرانہ سالی کے ہر نشست میں ضرور تشریف لاتے اور صدارت کے فرائض انجام دیتے۔ پنجاب سے کئی اچھے شاعر تقسیم کی بدولت دلی پہنچ چکے تھے وہ بھی ان نشستوں میں شرکت کرنے لگے۔ میں اردو مجلس کو جمانے کے لئے ان دنوں کافی دوڑ دھوپ کرتی رہی۔ کنور صاحب بھی مجھے امداد دیتے رہے اور فروری میں یوم غالب منانے کی تیاریاں ہم نے بہت زور شور سے کیں۔ ۱۹۴۷ء کی تباہی کے بعد دلی میں پہلی مرتبہ یوم غالب پر طرحی مشاعرہ ہوا جس کا افتتاح سفیر افغانستان سردار نجیب اللہ نے کیا۔ اور مشاعرے کی صدارت قاضی عبدالغفار صاحب نے فرمائی جو اس وقت مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری تھے، طرحی مصرع تھا: "سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں" جوش ملیح آبادی جو عام طور پر طرحی غزل نہیں کہتے تھے اس مشاعرے کی طرح میں غزل سرا ہوئے۔ اجمل خاں صاحب اور قاضی عبدالغفار صاحب نے میرا بہت حوصلہ بڑھایا اور یوم غالب کی کامیابی پر مبارکباد دی۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔

مولانا نے کہا "ہاں بھائی! دلّی کی تباہی اس بڑے پیمانے پر ہوئی کہ ۱۸۵۷ء کو بھی بھول جانا پڑا۔ یہ بتاؤ اب دلّی میں ڈولیاں کتنی ہیں"

میں نے عرض کیا "تین چار ڈولیاں ہیں بس میری والدہ اور خالہ اماں یا حکیم اجمل خاں کے خاندان کی چند بیگمات ڈولیوں میں بیٹھتی ہیں ورنہ اب رکشہ کا رواج دلّی میں عام ہے۔ اس میں سب ہی بیٹھتے ہیں"

مولانا نے یہ سُن کر چند لمحے سکوت کیا۔ اور پھر سوال کیا " دلّی میں اچھے خاندانوں کے لوگ اب کتنے رہ گئے"

میری چھوٹی بہن اختر مرحومہ جلدی سے بولی "اب تو صرف بڈھے یہاں رہے ہیں جوان تو سب پاکستان چلے گئے"

مولانا نے یہ سُن کر ٹھنڈا سانس لیا اور سوچ میں غرق ہوگئے۔ مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا، اب سوچتی ہوں کہ کیا گذرتی ہوگی مولانا کے دل پر۔ جس آزادی کی خاطر پوری جوانی اُنھوں نے جیلوں میں گذاری اور چہیتی بہن محبت کرنے والی بیوی کو مرتے دم بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کا پھل ان کو بجز مشکلات کے کچھ نہ ملا۔ ملک آزاد ضرور ہوگیا مگر تقسیم کی بدولت مسلمان جس طرح برباد ہوئے اور ان کی حالت جو دگرگوں ہوئی اُس کا اثر مولانا سے زیادہ اور کس پر ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ بوڑھا جنرل آزادی کی لڑائی لڑتے لڑتے تھک چکنے کے بعد بھی ملک و قوم کی بہبودی کے لئے کام کیئے جا رہا تھا۔

مہینے میں ایک دو بار اپنی دونوں بہنوں کے ساتھ میں ضرور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتی تھی وہ ہر بار دلّی والوں کا حال پوچھتے "شریف منزل[1]" میں کتنے لوگ باقی رہ گئے ہیں؟ کون چلا گیا؟ اس کی تفصیل دریافت کرکے کچھ دیر بات کرتے تو کچھ دیر عالم سکوت میں رہتے تھے،

آکا بھائی آسام سے آئے تو مولانا نے اُن کو اور ہم تینوں بہنوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس دن مولانا کی طبیعت ذرا شگفتہ تھی۔ آکا بھائی سے آسام کی سیاست پر گفتگو کرتے رہے اور پھر مسکرا کر فرمایا" میرے بھائی! آسام سرسبز ہے، شیلانگ تو بہت ہی خوبصورت ہے لیکن آسام کے لوگ کچھ یونہی ہیں۔ شئے لطیف کی اُن میں خاص کمی ہے"

آکا بھائی نے کہا "جی ہاں! آپ بجا فرماتے ہیں لیکن جو لوگ میر جملہ کے ساتھ آسام گئے اور

---

[1] حکیم اجمل خاں کی حویلی جہاں کبھی مولانا آزاد حکیم صاحب کے مہمان ہوتے تھے۔

چند لمحوں بعد آداب کیا اور بہت مغموم واپس آگئی۔ سوچ رہی تھی کہ اب کیا کروں۔ شنکر پرشاد سے کیسے کہونگی کہ مولانا آنا نہیں چاہتے۔ رات کو اس اُدھیڑبُن میں نیند بھی ٹھیک طرح سے نہیں آئی۔ دوسرے دن صبح نو بجے اجمل خاں کا فون آیا "مولانا صاحب نے آج شام کو پانچ بجے آپ کو بُلایا ہے"۔ میں حاضر ہوئی تو مولانا نے بہت مہربانی سے فرمایا، آؤ بھائی آؤ۔ کون کون خاص مہمان تمھارے یوم غالب میں ہوں گے" میں نے اطمینان کا سانس لیا اور کہا "شنکر پرشاد صاحب صدر استقبالیہ ہیں، مولانا حفظ الرحمٰن صاحب جلسے کی صدارت کریں گے۔ سفیر ایران اور سفیر افغانستان کو بھی مدعو کیا ہے۔ امام جامع مسجد اور مولانا احمد سعید صاحب بھی تشریف لائیں گے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب تو میزبان ہی ہیں۔ لالہ شیام ناتھ بہت دلچسپی لے رہے ہیں"۔

مولانا نے فرمایا "ٹھیک ہے، میں آؤں گا۔ یہ بتاؤ کچھ روپیہ بھی تم نے اس کام کے لئے جمع کر لیا ہے" میں نے کہا "اب آپ کی منظوری مل گئی تو روپیہ بھی جمع کر لوں گی"۔

مسکرا کر فرمایا "ٹھیک تو کہتی ہیں بہن۔ تم کو کام کرنے کا تو شوق ہے مگر طریقہ نہیں آتا۔ بھلا بغیر روپے کے انتظام کس طرح ہو سکتا ہے"۔ پھر اجمل خاں کو بُلا کر کہا "مسعود سے کہہ دو۔ یوم غالب کے لئے پانچسو کا چیک کل انہیں بھجوا دیں۔ اور شنکر پرشاد کو فون کر دو۔ کل دوپہر کو بارہ بجے آفس میں مجھ سے مل لیں"۔ میں بہت مسرور واپس آئی، پھر یہ یوم غالب اس شان سے ہوا کہ دلّی اور بیرون دلّی جس نے بھی آل انڈیا ریڈیو پر مولانا آزاد کی تقریر دلپذیر سُنی وہ تعریف کیئے بغیر نہ رہ سکا۔ تقریبًا پون گھنٹے مولانا بولے اور اُنہوں نے تقریر کے دوران میں فرمایا "کہ ہندوستان کی دو زبانیں اپنے بیش بہا ادب کی وجہ سے باہر کی زبانوں کے ادب کا مقابلہ کرتی ہیں، ایک ہے اُردو اور دوسری ہے بنگالی ——"

اُس دن ہوا یہ تھا کہ مولانا تو مقررہ ٹائم پر پہنچ گئے تھے اور مجمع ابھی بہت کم تھا۔ میں گھبرائی کہ اب پھر مولانا ناراض ہوں گے مگر میری پریشانی کو اُنہوں نے تاڑ لیا اور فرمایا "گھبراؤ نہیں۔ ہم ہندوستانی لوگ وقت کی پابندی کا کہاں خیال رکھتے ہیں" پھر خواجہ حسن نظامی اور امام جامع مسجد سے باتیں کرتے رہے، ہوا بھی یہی کہ مولانا کے تشریف لانے کے دس منٹ کے اندر اندر چونسٹھ کھمبے کے میدان میں لوگ کھچا کھچ بھر گئے اور یوم غالب بہت کامیاب رہا۔

۱۹۵۳ء میں والدہ صاحبہ[1] تو بیع نجستہ کے حسب معمول جون کے مہینے میں شیلانگ آکا بھائی کے پاس

[1] میری والدہ۔ رقیہ سلطان۔

مولانا صاحب سے ضرور اس جلسے کی کامیابی کا ذکر کر دیں تاکہ آئندہ یوم غالب پر میں اُن کو یہاں مدعو کر سکوں اور مزار غالب کی شکستہ حالی دکھا سکوں" ان دونوں صاحبوں نے خوب میری مدح سرائی کی اس لئے جب میں حاضر ہوئی تو مولانا نے شفقت بھرے لہجے میں فرمایا: "مجھے یہ سن کر بہت مسرت ہوئی کہ تم اُردو کی ترقی کے لئے بہت محنت کر رہی ہو اور یوم غالب کی تقریب شاندار طریقے سے تم نے منائی" غالب کے سلسلے میں اُردو والوں نے ابھی تک ڈھنگ سے کام نہیں کیا ہے یہ بہت بڑا قرضہ ہے جس کو اُتارنا قوم و ملک کا فرض ہے" پھر فرمایا، "اپنے کام کو بامقصد بناؤ، انجمن ترقی اُردو کی شاخ دلی میں قائم کرو، کیونکہ مرکزی انجمن تو تقسیم ملک کی بدولت علی گڈھ پہنچ گئی" میں نے عرض کیا "آپ کے حکم کی تعمیل بخوشی کروں گی" فرمایا،" میں قاضی عبدالغفار سے کہہ دونگا کہ وہ سند الحاق تم کو دے دیں! ان سے انجمن کے قواعد و ضوابط تم منگا لینا۔ کیفی صاحب انجمن کے پُرانے کارکن ہیں اُن کا تمہارے ساتھ کام کرنا تمھارے لئے بہت کار آمد ہے"

اس دن کامرانی کے نشے میں جھومتی ہوئی میں واپس آئی اور ایسا کیوں نہ ہوتا مجھے اپنے کاموں کی داد مولانا ابوالکلام آزاد سے ملی تھی۔ میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا تھا۔ پھر مئی سنہ ۱۹۴۹ء میں دلی شاخ بنی اور سنہ ۱۹۵۰ء فروری میں ہم نے یوم غالب منانے کا شاندار پروگرام بنایا۔ اس وقت کے چیف کمشنر شنکر پرشاد صاحب بہت علم دوست اور ادب نواز انسان تھے۔ میں نے اُن سے کہا "مولانا آزاد کو اس مرتبہ یوم غالب کے افتتاح کرنے کے لئے میں کہوں گی آپ صدر استقبالیہ بن جائیے" اُنہوں نے بہت مہربانی سے میری تجویز منظور کی۔ اور میں خوشی خوشی مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور عرض کیا "کہ میری اور اراکین مجلس عاملہ کی دلی خواہش ہے کہ یوم غالب کا افتتاح آپ فرمائیں" میرا یہ کہنا تھا کہ مولانا ایک دم بکھر گئے، غصّے سے ان کا رنگ سُرخ ہو گیا اور گرجتی ہوئی آواز میں بولے "کون ہے اب سُننے والا۔ میں کس کو ادب پر تقریر سُناؤں، کوئی نہیں رہا سب کچھ ختم ہو چکا ہے، کس کو اب ابوالکلام کی ضرورت ہے میں اب صرف وزیر تعلیم ہوں اور ایک گوشہ نشین انسان۔ فضول بات مت کرو، میں نہیں جاؤں گا" میں مولانا کا یہ انداز دیکھ کر بہت افسردہ سر جھکا کر مایوسی کے عالم میں بیٹھی رہی، اختر سے میری یہ حالت دیکھ کر رہا نہ گیا" واہ! مولانا صاحب بیچاری آپا کو آپ نے اس وقت ناحق ڈانٹ دیا۔ اِدھر تو والدہ صاحبہ ان کے کام کرنے پر ہر وقت نصیحتے کرتی ہیں اِدھر آپ بلا وجہ خفا ہو رہے ہیں، ایسا تو نہیں چاہیئے"

مولانا نے کچھ جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو مروڑتے رہے۔ میں نے

عید کے دوسرے روز صبح آداب کے لئے حاضر ہوں گے اور شام تک حنیفہ بہن کے پاس رہیں گے۔"
فرمایا، ہاں ہاں! جب جی چاہے آؤ تمھارا گھر ہے۔"
اور جس رات کو ہم گھر واپس آئے بہت سارا پھل حنیفہ بہن نے ہمارے ساتھ کر دیا۔ عید کے دوسرے
روز ہم نے خوب خوشیاں منائیں، مولانا کے یہاں سے رفیع احمد قدوائی صاحب کے یہاں پہنچ گئے۔ اور
وہاں سے رات گئے گھر واپس ہوئے۔ ایک مرتبہ میری سہیلی بیگم زہرہ انصاری اور میں چند منٹ کے آگے پیچھے
مولانا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ مولانا ابھی دفتر سے تشریف نہیں لائے تھے اس لئے ہم دونوں
اُن کا انتظار کرنے لگے۔ موضوع گفتگو اُردو کا رسم الخط تھا۔ زہرہ کا کہنا تھا کہ اگر رسم الخط کا خیال نہ کیا جائے
تو اُردو ہندی کا جھگڑا ختم ہو جائیگا اور میں کہہ رہی تھی کہ ایسا ہوا تو اُردو ہی ختم ہو جائے گی۔ زہرہ میری
بات نہیں مان رہی تھیں اور اپنی ہی کہے جاتی تھیں۔ کار ٹھہرنے کی آواز آئی تو میں نے کہا "مولانا صاحب
تشریف لے آئے، اب اُن سے پوچھے لیتے ہیں۔ کون سی بات ٹھیک ہے" وہ ہم دونوں کو دیکھ کر مسکرائے
اور فرمایا "تم دونوں بہت دنوں بعد آئی ہو، کیا بات ہے؟"
زہرہ نے کہا "میں بیمار ہو گئی تھی اس لئے حاضر نہیں ہو سکی۔"
میں نے جواب دیا "کہ میں تو ایک بار اور حاضر ہوئی تھی۔ آپ اپنی خوابگاہ میں تشریف رکھتے تھے،
اجمل خاں صاحب نے کہہ دیا آپ بیحد مصروف ہیں اور نہیں ملیں گے۔ دو مرتبہ ٹیلیفون پر ملنے کے لئے وقت
مانگا جب بھی خاں صاحب نے یہی جواب دیا کہ مولانا صاحب آجکل بہت مصروف ہیں، آخر میں ان سے
بغیر وقت لیے آج گھبرا کر آپ کو دیکھنے کے لیے چلی آئی۔"
مولانا نے ہنس کر فرمایا "خاں صاحب کا تو دماغ خراب ہے تم کو ہر دن آنے کی اجازت ہے۔ میں
اُن لوگوں سے ملنا نہیں چاہتا جو فضول باتیں کر کے میرا وقت ضائع کرنا چاہتے ہیں۔" میں نے عرض کیا
"زہرہ کہتی ہیں کہ رسم الخط اُردو کا نہ رہے تو مضائقہ نہیں اور میرا کہنا ہے کہ ایسا ہوا، تو اُردو ختم ہو جائے گی۔"
مولانا نے فرمایا "زہرہ غلطی پر ہیں تم ٹھیک کہتی ہو، رسم الخط باقی نہ رہے گا تو اُردو مٹ جائے گی"
میں جب بھی جاتی انجمن کے کاموں کے متعلق مجھے ہدایات دیتے، حضرت علامہ کیفی کی عافیت دریافت
فرماتے۔ اجمل خاں صاحب تو ان دنوں ہماری مجلس عاملہ کے ممبر ہی تھے ۱۹۵۶ء میں اُردو کانفرنس کرنیکی تجویز
رکزی انجمن نے منظور کی۔ تیاریاں ہونے لگیں خیال تھا کہ دسمبر میں کانفرنس ہو سکے گی لیکن نہ تو تیاریاں
ـل ہوئیں نہ پنڈت جواہرلال نہرو کو دسمبر اور جنوری میں فرصت تھی۔ اس لئے کانفرنس فروری میں کرنے کا
بلس عاملہ نے فیصلہ کیا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ ۱۵ فروری سے قبل پنڈت جی کو اور مولانا آزاد دونوں کو فرصت نہیں تھی

چلی گئیں۔ میں ان کے ساتھ اس لئے نہ جا سکی کہ جون کے وسط میں مرکزی انجمن کی میٹنگ ہونے والی تھی اور مجھے اس میں شرکت کرنی تھی۔ اختر نے بھی میرا ساتھ دیا وہ بھی اس زمانے میں اپنے سوشل کاموں میں بہت لگی ہوئی تھیں۔ ہم دونوں نینی تال بیس روز رہ کر واپس آئے۔ وہاں تو روزے خوب اچھے گذر گئے خیال تھا کہ جولائی کی ۱۵ ہو چکی ہے اب دلی میں بھی رم جھم شروع ہو گئی ہوگی۔ مگر یہاں جب ہم پہنچے تو گرمی کے مارے دلی تپ رہی تھی۔ صرف ایک دفعہ بارش ہو کر رہ گئی تھی۔ روز ابر آتا اور چلا جاتا۔ میں نے آنے کے دوسرے روز مولانا کی نسبتی بہن حنیفہ بیگم کو فون پر بتایا کہ دلی واپس آ گئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ کل آپ دونوں یہیں روزہ کھولیں۔ اور گرمی سے بے حال چھ بجے شام کو جب ہم دونوں وہاں پہنچیں تو حنیفہ بہن ہمارے مرجھائے ہوئے چہروں کو دیکھ کر محبت بھرے لہجے میں بولیں " ارے آپ وہاں کیوں رہ رہی ہیں، پہاڑ پر سے آنے کے بعد تو گرمی اور بھی محسوس ہوتی ہے، خالہ جان تو ہیں نہیں آپ یہاں آ جائیے میں تو یہاں تنہا روزے رکھتی ہوں ساتھ مل کر روزے اچھے گذریں گے "

میں نے کہا " بہت اچھا۔ کل تو جمعہ ہے میں قریبی مساجد میں افطاری بھیجوں گی۔ انشاء اللہ پرسوں یہاں رہنے کے لئے ہم دونوں آ جائیں گے "

روزہ کھولنے سے چند منٹ قبل مولانا صاحب بھی دفتر سے تشریف لے آئے ہمیں دیکھ کر خوش ہوئے تھوڑی دیر ہم سے باتیں کیں۔ اجمل خاں صاحب نے ہمایوں کبیر کے آنے کی خبر دی تو حنیفہ بہن سے کہا۔ " کھجوروں کے ڈبے ان کو دے دو،

ہفتے کی شام کو حنیفہ بہن کے پاس ہم پہنچ گئے تو وہ چشم براہ تھیں۔ اپنے قریب کا کمرہ ہمارے لئے درست کرا دیا تھا۔ گلدان میں گلاب کے تازہ پھول مہک رہے تھے اور ضرورت کی ہر چیز کمرے میں موجود تھی۔ پانچ روز ہمارا قیام مولانا کی کوٹھی پر رہا اور ان سے ملاقات کا شرف روزانہ روزہ کھولنے کے وقت ہی ہوتا تھا۔ افطار کی میز پر انواع واقسام کی نمکین چیزیں ہوتی تھیں اور پھل بھی۔ مولانا بے حد شفقت سے ایک ایک چیز کو ہم سے کھانے کے لئے اصرار کرتے۔ ایک دن فرمانے لگے " تم لوگ کہیں جانا چاہو، تو میری کار لے لیا کرو، میں تو صرف آفس جاتا ہوں اور دوپہر کو وہاں سے ڈیڑھ بجے آ کر پھر چار بجے جاتا ہوں۔ اتنی دیر تو کار یہاں کھڑی رہتی ہے "

میں نے عرض کیا " پرسوں ہمیں گھر جانے کی اجازت دیجئے "

فرمایا " ارے بہن تو یہاں نہیں ہیں، عید پر اکیلی کیوں رہو، یہاں میرے ساتھ رہو "

میں نے عرض کیا " جی بڑی خالہ اماں ہیں۔ عید کے دن وہ ہماری منتظر رہیں گی ...... "

حمیدہ بہن ! مولانا آزاد غسل خانے میں گر گئے اور گرنے کے بعد سے ابھی تک بے ہوش ہیں "
یہ وحشتناک خبر سُن کر میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے ، حواس باختہ ہوکر مولانا کی کوٹھی پر فون لگایا بہت دیر تک فون نہیں ملا - اور فون لگا تو اجمل خاں نہیں - مولانا کے آفس کے پرائیوٹ سکریٹری مسعود مرزا بول رہے تھے" اُنہوں نے کہا " جی ہاں ! مولانا صاحب ابھی تک بیہوش ہیں ۔ آپ آنا چاہتی ہیں تو آجائیے میں پریشان حال پہنچی ، دونوں بہنیں مجھ سے قبل آچکی تھیں اُنکو پارلیمنٹ میں مولانا کی علالت کی خبر مل گئی تھی حنیفہ بہن بیچاری بہت مغموم اور پریشان تنہا بیٹھی تھیں ہمیں دیکھ کر رونے لگیں ۔ میں نے اُنکو گلے لگا کر تسلی دی -
مولانا آزاد کے کمرے میں ڈاکٹر آجا رہے تھے ۔ پنڈت جی صبح سے دو بار چکر لگا چکے تھے ۔ مولانا کے دماغ کی رگ پھٹ گئی تھی اور وہ بیہوش تھے ۔ صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام اور شام سے رات ہوگئی ۔ مولانا کی حالت جوں کی توں رہی ، ہم تینوں حنیفہ بہن کے پاس رہے ، رات کچھ جاگ کر کچھ سو کر کٹی ۔ صبح پانچ بجے عالم غنودگی سے میں چونک پڑی مولانا آزاد کی آواز میرے کانوں میں آئی ۔ وہ بول رہے تھے کیا کہہ رہے تھے ، یہ سمجھ نہیں سکی لیکن اُن کی آواز سُن کر دل کو یہ اطمینان ہوا کہ اُن کو ہوش آگیا ۔ خدا نے ہم پر رحم فرمایا ۔ اب رفتہ رفتہ صحت بھی ہو جائے گی ۔ گر چھ بجے اخبار لینے میں ان کے آفس کی جانب گئی تو ڈاکٹر آل انڈیا ریڈیو پر مولانا کی صحت کے متعلق بلیٹن دے رہا تھا ۔ کہ اُن کی حالت کچھ بہتر نہیں ہے ، اور زندگی کی اُمید بہت کم ہے ، مگر حیرت کی بات ہے کہ دماغ کی رگ پھٹنے کے بعد بھی نیم مدہوشی کے عالم میں وہ بول رہے ہیں "
مجھے چونکہ ذرا اطمینان ہو گیا تھا ۔ اس لئے دس بجے کے قریب دونوں بہنوں کے ساتھ گھر آگئی ۔ جمعہ کا دن تھا غسل کر کے ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ہم لوگ مولانا کی کوٹھی پر تقریباً چار بجے پہنچے ۔ تو دیکھا شامیانہ لگ رہا ہے ۔ کرسیاں رکھی جا رہی ہیں " میں نے حیرت سے پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے "
تو ایک چپراسی نے کہا " مولانا کی حالت ٹھیک نہیں ہے بس کچھ دیر کے مہمان ہیں اس لئے لوگوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا جا رہا ہے " دفتر میں مسعود مرزا خاموش بیٹھے تھے ۔ اور مولانا آزاد کے کمرے کے سامنے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اجمل خاں بُت کی مانند سر نگوں تھے ۔ میں نے ان کو ہلا کر بیچینی سے کہا "کیا مولانا صاحب کی طبیعت پھر زیادہ خراب ہوگئی " اُنہوں نے ٹکٹکی لگا کر آنکھوں سے دیکھا اور سر ہلا کر کہا " ہاں ! "
پنڈت جواہر لال نہرو اپنے دیرینہ رفیق اور غمگسار ساتھی کے ساتھ چھوٹنے سے بے حال گھبرائے ہوئے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکّر لگا رہے تھے ۔ ہم تینوں پھر حنیفہ بہن کے پاس جا کر بیٹھ گئے ۔ ان بیچاری کی حالت قابل رحم ہوگئی تھی ۔ اور اب ان کو تشفّی بھی کن الفاظ میں دی جا سکتی تھی ۔

مجلس عاملہ کی میٹنگ میں تاریخ طے کرنے کا مسئلہ پیش ہوا۔ مولانا حفظ الرحمٰن نے کہا۔ ۱۵ یوم غالب کی تاریخ ہے حمیدہ سلطان کو اعتراض ہوگا۔" میں نے کہا" جی نہیں۔ آپ شوق سے کانفرنس کیجئے۔ غالب اور اُردو، ایک ہی چیز ہیں۔ ہم یوم غالب بعد میں منالیں گے۔" سرور صاحب نے کہا" اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ غالب کی وفات کی تاریخ کو کانفرنس کا افتتاح کیا جائے" میں نے کہا" غالب سوسائٹی والے ۱۴ر فروری کو مزار غالب پر فاتحہ خوانی و کلیاتی کا پروگرام رکھے ہیں ہم ۲۱ر یا ۲۲ر فروری کو یوم غالب کریں گے، آپ ۱۵ر فروری کو ضرور کانفرنس کا افتتاح کرائیں میرا دل کہتا ہے کہ اگر اس تاریخ کو کانفرنس کا افتتاح نہ ہوا تو اس مہینے میں کانفرنس ہونا ناممکن ہوگی۔"

مولانا حفظ الرحمٰن نے فرمایا" ہاں، بھائی یہ ہی مناسب ہے۔"

اور پھر کانفرنس ۱۵ر فروری کو ہوئی اس کا افتتاح پنڈت جواہرلال نہرو نے کیا۔ اور تقریر کے دوران میں کہا" اگر بیس بچے بھی کسی اسکول میں ہونگے تو اُردو کلاس کا باقاعدہ انتظام کیا جائے گا۔" مولانا نے فرمایا۔

" نہیں، جواہرلال! کہو، اگر دس بچے بھی ہوں گے تو ہم اُردو کلاس کا انتظام کریں گے۔"

پنڈت جی نے مسکرا کر کہا" مولانا کا ارشاد ہے ہم دس بچوں کے لئے بھی انتظام کر سکتے ہیں۔"

اس کانفرنس میں اُردو کے شیدائی دور دور سے آئے تھے۔

اس دن جن لوگوں کو شکوہ تھا کہ مولانا ۱۹۴۷ء کے بعد اُردو کے سلسلے میں کچھ نہیں کہتے اور بالکل خاموش ہیں مولانا کی تقریر سُن کر وجد کرنے لگے لیکن جب وہ بول رہے تھے تو اُن کی آواز کچھ بھرائی ہوئی سی تھی اور سانس پھولا ہوا لگ رہا تھا۔ ایک دم مجھے یہ خیال آیا کہ اب مولانا زیادہ دن نہیں رہیں گے، پھر اس خیال پر خود کو میں نے بہت نفرین کہا۔ اس دن مولانا نے عادت کے خلاف دو یا تین پیالیاں چائے کی پیں۔ وہ کبھی کسی جلسے میں چائے نہیں پیتے تھے اور بہت سے آٹوگراف بھی دیئے اور تقریر کے دوران اُنہوں نے فرمایا" میں پھر یہاں آؤں گا" مولانا آزاد کا یہ آخری دیدار اُردو والوں کیلئے تھا اور انکی آخری تقریر اُردو کی وکالت کے لئے تھی شاید یہ اُن کی دلی آرزو تھی۔

کانفرنس بخیر و خوبی ختم ہوگئی ۱۹ر فروری کو میں نے باہر سے آئے ہوئے مخصوص شعراء و ادباء کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا اور ہم سب مولانا کی تقریر پر بہت مطمئن اور مسرور انداز میں گفتگو کرتے رہے، ۲۰ر کی صبح میری دونوں چھوٹی بہنوں نے کہا" آپا، ہم پارلیمنٹ جا رہے ہیں، وہاں سے مولانا صاحب کے یہاں جائیں گے، آپ چلیں گی۔"

میں نے کہا" میں بہت تھک گئی ہوں آج تو مجھے آرام لینے دو، دو تین دن بعد جاؤنگی۔"

ان دونوں کو گئے تقریباً ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔ گیارہ بجے لالہ شیام ناتھ کا فون آیا" آپ کو علم ہے

مولانا محمد شعیب عمری

مولانا آزاد کا طرزِ تصوّف

افضل العلماء مولانا محمد شعیب عمری دورِ حاضر میں اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں کہ جن کے سینوں میں ماضی کی ان گنت داستانیں محفوظ ہیں، قدیم سرمایہ بھی نظروں کے سامنے ہے، اور دورِ حاضر کے علوم سے گہری واقفیت بھی رکھتے ہیں۔ اس خوبی کے ساتھ حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی امانتوں کے امین بھی ہیں، آزادؒ شناسی میں انھیں کمال بھی حاصل ہے، مولانا کی زبان و قلم سے نکلا ہوا ایک ایک فقرہ ان کے مطالعہ میں آچکا ہے، بکثرت مقالے ہند و پاک کے بلند پایہ اخبار و رسائل میں حضرت امام الہند کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ جس میں اس "مجمع البحرین" کا صرف تعارف نہیں۔ بلکہ ان کے اسرار و معارف کی نقاب کشائی بھی ہے، وہ مولانا پر جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں تحقیق کا پوری طرح حق ادا کرتے ہیں۔

شعیب عمری صاحب اپنی وسعت علم و نظر اور آزاد شناسی کی وجہ سے میرے دوست ہی نہیں بلکہ میرے فکر و خیال سے قریب تر بھی ہیں۔

زیر نظر تحریر کوئی ان کا مقالہ نہیں، بلکہ راقم الحروف کے نام ایک خط ہے، جو انہوں نے "ابوالکلام آزاد — احوال و آثار" کے لئے تاریخ کے تعین کے ساتھ مقالہ کی فرمائش پر معذرت کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس سے ان کی وسعت نظر اور آزاد شناسی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، وہ خط حاضر خدمت ہے۔ (خالدی)

۷۸۶

۵ راگست ۱۹۷۶ء
از بنگلور

گرامی قدر! سلام مسنون

آپ کا والا نامہ، نظر نواز ہوا، عذر خواہ ہوں کہ بوجہ ہجوم اشغال و عدم جمعیت خاطر جواب تاخیر سے ارسال خدمت کر رہا ہوں۔

رات کے دس بجے تک مولانا کی حالت جوں کی توں رہی، کچھ لوگ جو جمع ہوگئے تھے چلے گئے۔ ہم سب افسردہ اور خاموش بیٹھے اونگھتے رہے، رات کے ڈو بجے یکایک خجستہ نے جو بہت معصوم اور اللہ والی ہیں چونک کر کہا "آپا! مولانا صاحب کی بیوی کو میں نے دیکھا۔ وہ سفید ساڑی میں مولانا کے کمرے کے سامنے کھڑی ہیں اُن کے ساتھ ایک بزرگ بھی ہیں جن کے ڈاڑھی ہے اور صافہ باندھے ہوئے ہیں۔ اُن کی شکل نورانی اور مولانا سے ملتی ہوئی ہے۔"

حنیفہ بہن نے کہا "مولانا کے والد ایسے ہی تھے"، میں گھبرا کر مولانا کے کمرے کی جانب بھاگی۔ اجمل خاں صاحب منھ پر ہاتھ رکھے بچّوں کی طرح رو رہے تھے۔ میں نے ان کو جھنجھوڑ کر کہا "کیسے ہیں مولانا صاحب!" اُنھوں نے کہا۔ سب کچھ ختم ہوگیا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

میں نے کمرے کا دروازہ بے خیالی میں کھولا، سامنے پنڈت جواہر لال نہرو ڈریسنگ گون پہنے سر جھکائے کھڑے تھے۔ دوسری جانب مولانا کے بھتیجے نورالدین اور بہن کے نواسے محمد باقر مغموم کھڑے تھے۔ ابوالکلام اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہو چکے تھے۔ اور دلّی والے ۴۔ کنگ ایڈورڈ روڈ پر اُداس پڑے تھے۔ اُردو کے مقدمے کی وکالت جس جگہ ایک ہفتے قبل مولانا نے کی تھی اور فرمایا تھا "اب ہندی اُردو کا کوئی جھگڑا نہیں۔ ہندی سرکاری زبان ہے، اُردو کو اس کا حق ملنا ہی چاہئے"، وہاں اپنے کہنے کے مطابق دوسرے ہفتے کو زندہ نہیں تو مر کر پہنچ گئے اور دلّی کی خاک میں یہ گنج گراں مایہ بھی دفن ہوگیا۔

میں کس کس بات کو یاد کروں اور کہاں تک یہ روداد خونچکاں لکھوں۔ گورنمنٹ آف انڈیا نے جب یہ طے کر لیا کہ ہندی سرکاری زبان ہوگی تو میں حسب عادت بہت برافروختہ ہوگئی۔ اسی عالم جنون میں مولانا سے ملنے گئی تو حالانکہ اُن سے بہت مرعوب تھی لیکن اپنے غصّے کو ضبط نہ کرسکی۔ طنزیہ لہجے میں کہا "مولانا صاحب اب تو آپ شکشا منتری کہلائیں گے۔ اور پندرہ برس بعد تو اُردو کو بالکل مُلک سے خارج کر دیا جائے گا۔"

مولانا نے بڑے غمگین لہجے میں کہا "کون زندہ رہے گا، پندرہ برس تک" اور پھر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔

میری دونوں چھوٹی بہنوں نے کہا "آپ نے آج مولانا کو بہت صدمہ پہنچایا ایسا کہنا نہیں چاہئے تھا۔"

میں اپنی اس بیہودگی پر زندگی بھر پشیمان رہوں گی۔

اثرات پہنچے حتیٰ کہ فقہ و احکام تک کا گوشہ اس سے محفوظ نہ رہ سکا، اگر عہد صحابہؓ سے لے کر آخری عہد تدوین کتب کی کتابیں مسلسل موجود ہوتیں اور صدیوں کی ترتیب کے ساتھ ان پر نظر ڈالی جا سکتی تو صاف نظر آجاتا کہ صدر اوّل کے واقعات و معاملات بعد کے ہر عہد میں نئے نئے لباس بدلتے آئے ہیں اور ان کی تعبیر و الفاظ کی جزئیات میں ہر عہد کی ذہنی خصوصیات کا پرتو موجود ہے مثلاً اگر تیرہ صدیوں کی تیرہ مسلسل تاریخیں موجود ہوتیں تو تم انگلی رکھ کر بتلا سکتے کہ صدر اوّل کے ایک ہی واقعہ نے اپنی جزئیات و صورت میں کس طرح تیرہ مختلف لباس پہن لئے ہیں؟ -

(الہلال ۱۵ر جولائی ۱۹۲۷ء)

(۲) "حجت ابراہیمی" کے زیر عنوان، متکلمین اسلام کے منطقی ذوق پر اپنا تاسف ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں -

"افسوس ہے کہ متکلمین کا ذوق، طریق قرآن کی اہمیت و حقیقت معلوم نہ کر سکا۔ انہوں نے قرآن کو بھی وہی منطقی جامہ پہنا دینا چاہا جو خود انہوں نے علم و نظر کے ہر گوشے میں پہن لیا تھا، چونکہ یہ طریقہ قرآن کے لئے ایک مصنوعی طریقہ تھا اسلئے قدم قدم پر طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں، لغت ساتھ نہیں دیتی تھی، عربی اسلوب و بیان قطعاً مخالف تھا۔ سیاق و سباق کا مقتضا کچھ اور ہی کہتا تھا سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن کا عام نظم بیان اس طریق کے ساتھ چل نہیں سکتا تھا تاہم وہ اپنی موشگافیوں اور کوہ کندنیوں میں برابر بڑھتے ہی گئے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر ایک نیا کارخانۂ استدلال گڑھ کر کھڑا کر دیا۔ اب دُنیا کہتی ہے کہ قرآن کی مشکلات حل نہیں ہوتیں، لیکن کوئی نہیں جو اس حقیقت پر سے پردہ اُٹھائے کہ مشکلیں قرآن کی مشکلیں نہیں ہیں، مفسرین کی پیدا کی ہوئی مشکلیں ہیں۔ اگر ایک بات کو اس کی زبان، اس کے اسلوب، اور اس کے قدرتی معانی سے ہٹا کر ایک دوسری طرح کی شکل دیدی جائے تو یقیناً وہ صاف نہیں رہے گی مشکلات کا ایک معمہ ہی بن جائے گی" الخ

(الہلال ۱۸ر نومبر ۱۹۲۷ء)

(۳) ارباب علم کے جواہرات علمی کے ضیاع پر افسوس ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مفلس کی قسمت سے زیادہ اس شخص کی قسمت پر افسوس کرنا چاہئے، جس کے پاس دولت کا کچھ نہ کچھ بقیہ موجود ہے، مگر وہ اس سے متمتع نہیں ہوتا، یہی حال آج تمام عالم اسلامی اور علی الخصوص مسلمانان ہند کا ہے، وہ ہر چیز میں صرف اسی چیز کا ماتم کرتے ہیں جو جا چکی ہے مگر جو کچھ موجود ہے اس سے خبردار ہونے اور کام لینے کا کسی کو ہوش نہیں، مذہب کو، علم کو، تمدن کو، اخلاق کو،

مولانا آزاد میموریل اکاڈمی کے قیام کی خبر سُن کر اور اس کے مقاصد معلوم کرکے غایت درجہ خوشی ہوئی۔ جزاکم اللہ احسن الجزا۔

اس حقیقت کے اظہار میں الحمدللہ کوئی غلو محسوس نہیں کرتا کہ میں نے مولانا آزاد کی تصانیف اور ان کے شہرہ آفاق الہلال والبلاغ کی ایک ایک سطر پڑھی ہے مطالعہ کے دوران، میں نے ہر موضوع سے متعلق بے شمار اقتباس اخذ کئے۔ یہ اقتباس ایک طرف حقائق پرور اور بصیرت افروز ہیں تو دوسری طرف بحیثیت سبق آموزی، عبرت پذیری اور اثر انگیزی نہایت اہم اور وقیع ہیں، ان جواہر پاروں کے مطالعہ کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے ان میں، اپنے جگر کے ٹکڑے پھیلا دیئے ہیں۔ نیز وہ تمام اقتباس بھی میں نے اخذ کر لیئے ہیں، جن میں مولانا نے نہ صرف اپنی ذاتِ گرامی پر بلکہ متعدد امور و احوال پر اپنے تاسّف کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً کسی مقام پر مسلمانوں کے غلط عقائد، رسوم و زوائد، پست ہمتی، غفلت و جمود اور جمود و خمود پر ماتم کیا ہے توکسی اور مقام پر ان کے اندر سے جذبۂ خود اعتمادی و خود شناسی کے مفقود ہوجانے پر آہ کھینچی ہے، کسی جگہ مسلمانوں کی بے روح عبادات پر ان کے قلم نے خوں باری کی ہے توکسی اور مقام پر ارباب علم وتحقیق کی بے کسی اور کس مپرسی پر رقت انگیز آنسو بہائے ہیں، علوم وفنون کی متعدد شاخوں میں، مؤرخین، متکلمین اور دیگر ائمۂ علم و فن نے، اصل حقائق اور بنیادی مسائل کو جس طرح اپنے ذوق وفہم کے رنگ میں رنگ کر نئی شکل دیدی ہے، اس پر بھی گہرے تاسف کا اظہار فرمایا ہے، مثلاً صدر اوّل کے مسلمانوں کی تدوین تاریخ پر سیر حاصل روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(۱) "افسوس ہے کہ صدر اول کے مسلمانوں کی تاریخ کا چہرہ، متاخرین کی نقاشیوں سے اپنے اصلی خال وخط کھو چکا ہے، ہر عہد کا مورخ در اصل اسی عہد کی دماغی آب وہوا کا مخلوق ہوتا ہے، اس لئے سلف کے واقعات کی تصویر کھینچتے ہوئے اسی رنگ وروغن سے کام لیتا ہے جو اس کے عہد کی آب وہوا مہیا کرسکتی ہے، اسلام کی حقیقی اور اجتماعی زندگی کا اصلی دور صحابہ کرامؓ کے عہد پر ختم ہوگیا اور اس کے بعد جوں جوں زمانہ گذرتا گیا اس دور کی معنوی خصوصیات مفقود ہوتی گئیں، متاخرین اہل نظر وقلم کا زمانہ آیا تو یہ وہ وقت تھا، جب صدر اوّل کی دماغی آب وہوا کی جگہ بالکل ایک مختلف قسم کی نشو ونما پاچکی تھی، اسلئے ان مصنفوں نے جب اُس عہد کے حالات پر قلم اُٹھایا تو بجائے اس کے کہ اُس عہد کا ذوق ومزاج پیدا کرکے اُس کا مطالعہ کرتے، اپنے عہد کے پیدا شدہ ذوق کے رنگ میں، اُس کی ہر بات رنگ ڈالی، تاریخ ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر گوشہ تک اس معاملہ کے

شکل میں مرتب کر کے آپ کی خدمت میں بھیجدوں مگر افسوس! وقت جو اپنی قدرتی رفتار میں ہمارے حالات اور موانع کی رعایت نہیں کرتا وہ اس تیزی سے نکلتا گیا کہ آپ کی ۳۰ر جولائی کی آخری تاریخ دیکھتے دیکھتے سامنے آگئی اور میں اس اہم علمی کام کی تکمیل سے محروم رہ گیا۔ انا للہ وَاِنّا اِلَیہِ راجعون!

بلاشبہ حضرات مولانا آزادؒ کے فوق البشر کمالاتِ علمی، جو منصّۂ شہود پر جلوہ افروز ہو چکے ہیں، انشاءاللہ تاقیام قیامت، آفتاب عالم تاب کی طرح روشن اور درخشاں رہیں گے، لیکن علوم و معارف کی وہ وسیع کائنات جو ان کی ذات گرامی میں مستور رہ گئی اور صفحۂ ہستی پر جلوہ نما نہ ہوسکی وہ یقیناً ایک عظیم اور ناقابل فراموش المیہ ہے، خود مولانا آزاد کو اس کا افسوس اور احساس تھا چنانچہ انھوں نے نہایت رقت انگیز الفاظ میں اپنے قلبی رنج کو اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔

"اگر پیام اجل سر پر آپہونچا (فان اجل اللہ لآت) تو آہ! کس سے کہئے اور کون جانتا ہے کہ اس مُشت خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپرد خاک ہوں گی۔ فیضان الٰہی نے اپنے فضل مخصوص سے علوم و معارف کے کیسے کیسے دروازے اس عاجز پر کھولے تھے جو بند کے بند رہ جائیں گے۔"

(الجمعیۃ آزاد نمبر)

بالآخر مشیّت الٰہی جس گھڑی کی منتظر تھی وہ نمودار ہوگئی اور بمطابق آیۂ کریمہ اِنَّ اَجَلَ اللہِ لَآتٍ، داعئ اجل آپہونچا اور مولانا آزاد اُس کی رفاقت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عالم بقا کی طرف کوچ کر گئے، اور جاتے جاتے اپنے ساتھ علوم و فنون کے ایک عظیم، بے کراں اور مواج سمندر کو بھی لے گئے، لیکن انھوں نے، مختلف شعبہائے علوم و فنون میں اپنی خدا داد صلاحیتوں سے جو بے شمار قدریں قائم کیں اور حیات اسلامی کی تعمیر کے لئے، قرآن و سنت کی روشنی میں جو بنیادیں فراہم کیں وہ الحمدللہ زندہ و باقی ہیں۔ انشاءاللہ آئندہ آنے والی نسلیں ان سے مستفید ہوں گی اور تعمیر حیات کے نقشے تیار کرتی رہیں گی۔ ولیس ذالک علی اللہ بعزیز۔

اب رہا مولانا آزاد کا یہ تاسف کہ "زمانہ ان کے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا" اپنی جگہ یقیناً درست ہے اور ایک مفصل و مشرح مقالہ کا طالب ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی ذات بابرکات جو دُنیا کے اعاظم و اکابر رجال میں سے ایک تھی وہ کسی صورت سے، دُنیا کے درج ذیل غیر متغیر قانون سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتی۔ علامہ جمال الدین افغانیؒ کے سوانح حالات قلمبند کرتے ہوئے خود مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"دُنیا نے ہمیشہ، اپنے اکابر و اعاظم سے ان کی زندگی میں غفلت برتی ہے، اور جب تک وہ دُنیا سے رخصت نہیں ہوگئے ہیں، اُن کے حقوق کا اعتراف نہیں کیا ہے، خصوصاً مصلحین و مجددین امم کے لئے

معاشرت کو غرضکہ حیات قومی کی جس شاخ کو دیکھئے گا یہی نظر آئے گا کہ مسلمانوں کی جیب اس قدر خالی نہیں ہے جس قدر ان کا ہاتھ بے خبر ہے، صرف اسی بات کو دیکھئے کہ ہندوستان سے علم وارباب علم کے رخصت ہو جانے پر کس قدر آنسو بہائے جاتے ہیں اور کس طرح ہمیشہ ماتم کیا جاتا ہے کہ علم وقلم کی صحبتیں برہم ہو گئیں، لیکن اس چیز پر کسی کی نظر نہیں پڑتی کہ علم وقلم کی آج بھی جو قابلیتیں موجود ہیں وہ کس طرح ضائع کی جا رہی ہیں اور ملک کی ناقدر شناسی اور بدامتیازی نے کس طرح انھیں مٹنے کے لئے گمنامی میں چھوڑ دیا ہے؟ کتنے ہی ارباب علم وفضل ہیں جن کا جوہر علمی آج صرف اسلئے رائگاں جا رہا ہے کہ ان کو امن کی ایک رات اور دل جمعی کی ایک صبح بھی نصیب نہیں، کتنے ہی ارباب قلم ہیں جو بہتر سے بہتر علمی خدمات انجام دے سکتے ہیں، لیکن ان کی تمام قابلیت کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اتنی استطاعت بھی نہیں رکھتے کہ ضرورت کی چند کتابیں خرید سکیں۔ کتنے ہی صاحبانِ استعداد وفکر ہیں جن کے لئے اصلی مشغلہ علم وفن کا تھا لیکن ان کا سارا وقت اس میں خرچ ہوتا ہے:۔

چہ خورد بامداد فرزندم

لوگ اس پر ماتم کرتے ہیں کہ جانے والے چلے گئے مگر کسی کی آنکھ نہیں روتی کہ جو باقی ہیں ان کی خبر لیں۔"

(البلاغ ۲۵ر فروری ۱۹۱۶ء)

(۴) مسلمانوں کی بے روح نمازوں پر تاسف ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

" افسوس مسلمانوں کی غفلت وجمود نے جہاں ان کی بداعمالیوں کی پاداش میں اُن سے ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں چھین لیں وہاں ان کے دلوں کی انگیٹھیاں بھی اس درجہ سرد ہو گئی ہیں کہ ان میں اب کوئی چنگاری اور کوئی گرمی باقی نہیں رہی، دل کا سوز وگداز، اللہ کے حضور جھکنے کا جذبہ، سچی انابت سچا عجز، غرضکہ سب کچھ سرد ومحو ہو چکا ہے، کون ہے جو نماز کی صحیح لذت اپنی نمازوں میں پاتا ہے، اور جب نماز کی لذت ہی نماز سے علیحدہ کر لی گئی تو پھر وہ ایک جسم ہے، جس میں جان نہیں، ایک پھول ہے جس میں خوشبو نہیں، ایک ڈھانچہ اور ہیولیٰ ہے، جس میں روح نہیں، ایسی نمازیں بیکار صرف قواعد ہوئی اور صرف ٹکر مارنا، بے نتیجہ، بے فائدہ، بے اثر"

(خطبات جمعات وعیدین)

مذکورہ اقتباسات پر اکتفا کرتے ہوئے عرض گذار ہوں کہ آپ کے مکتوب میں مولانا آزادؒ کے دردانگیز جملے پڑھ کر میری طبیعت بے اختیار آمادہ ہوئی کہ اس نوع کے جملہ اقتباسات کو مستقل مقالہ کی

مرزا محمد عسکری مرحوم

مولانا ابوالکلام آزاد

یہ مقالہ "من کیستم" ؛ خود نوشتہ سوانح جناب مرزا محمد عسکری صاحب مرحوم سے نقل کیا جا رہا ہے ، مرزا صاحب کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ، خاص طور پر "ادبی خطوط غالب" اور "تاریخ ادب اُردو" کی وجہ سے خاص شہرت کے مالک ہیں ، یہ مرزا محمد تقی کے صاحب زادے اور محمد مرزا خاں معروف بہ مرزا خانی کے پوتے تھے ، مرزا خانی کا تذکرہ ضمناً "آب حیات" مصنفہ شمس العلما محمد حسین آزاد میں دو جگہ موجود ہے ایک غالب کے ذکر میں ، کہ مرزا کے عمدہ کلام کا انتخاب ابتدا میں مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی نے کیا تھا ، دوسرے شاہ نصیر کے حالات میں ۔

مرزا محمد عسکری کی ولادت محلہ محمود نگر لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء میں ہوئی تھی ، مرزا صاحب ۱۸۹۲ء سے ۱۹۰۲ء تک کالون اسکول لکھنؤ سے وابستہ رہے ، آخر دسمبر ۱۹۰۲ء کو "لیجسلیٹو ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہیڈ ٹرانسلیٹر" کے عہدے پر فائز ہو کر کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے ، کچھ دنوں تک پردیس کی زندگی کی مصیبتوں سے دوچار رہے ، اس کے بعد مرزا صاحب کے لفظوں میں

"اب کچھ لوگوں سے ملاقات ہو گئی ، جو سہ پہر کے وقت مجھ سے ملنے آتے ، مگر در اصل چیت پور روڈ کے ہجوم کی سیر کرنے کی غرض سے میرے کمروں پر جمع ہو جاتے تھے ، مولوی خلیل احمد مترجم ہائی کورٹ سے بھی ملاقات ہوئی ، یہ نہایت سوشل اور با مذاق آدمی تھے اور میرے مکان کے قریب امر تلا لین میں رہتے تھے ، چونکہ ان کی باتوں میں لطف آتا تھا ، اکثر ان سے ملنے چلا جاتا تھا ، ایک دن اُنہوں نے اپنے یہاں دو نوعمر آدمیوں سے ملاقات کرائی ، یہ دونوں مولوی خیر الدین احمدؒ دہلوی کے صاحب زادے تھے ، جو ایک مشہور صوفی اور پیر تھے ، اور اس وقت امر تلا لین میں رہتے تھے ، ان دونوں آدمیوں میں ایک کا نام (کنیت یاد نہیں) محمد یٰسین ، اور دوسرے (نام یاد نہیں) ابو الکلام آزاد تھے یہی مولانا ابو الکلام آزاد جو اس وقت کانگریس کے پریسیڈنٹ ہیں ، آزاد کا سن اس وقت کسی طرح ۱۴ سے زائد نہ تھا ، مگر آثار بزرگی از ناصیتش ہویدا ۔" لے

لے من کیستم ؛ صفحہ ۴۷ ، ۴۸

تو زندگی میں تغافل اور موت کے بعد تعظیم و احترام، اس دُنیا کا ایک عام اور غیر متغیر قانون ہے"۔
(الہلال ۲۶ راگست ۱۹۲۷ء ع ۱۱ ص)

اب جبکہ مولانا آزاد اس دُنیا میں نہ رہے تو اس امر میں شک و شبہ کی گنجائش بھی باقی نہ رہی کہ مولانا کے حقوق اور ان کی عظمت و جلالتِ شان کے اعتراف کے لئے زمانہ جس ساعت کا منتظر تھا وہ نمودار ہوگئی۔ چنانچہ آپ کی اکاڈمی کا قیام خود اس حقیقت کی روشن دلیل ہے، انشاءاللہ وہ وقت بھی دور نہیں ہے جبکہ ملک بھر میں ابوالکلامیت کی تحصیل اور تصنیف و تالیف کتب کے لئے بے شمار ادارے قائم ہو نگے۔

والسّلام

محمد شعیب عمری

پوسٹ باکس نمبر 673 بنگلور (560002)

"افسوس ہے کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا.............کوئی سامان نہ کرسکا، غالب کو تو صرف اپنی ایک شاعری ہی کا رونا تھا، نہیں معلوم میرے ساتھ قبر میں کیا کیا چیزیں جائینگی"۔

ناروا بود بہ بازار جہاں جنس وفا
رونقے گشتم و از طالع دکاں رفتم

(ابوالکلام)

نقش آزاد (مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؔ) ۱۵۷

"افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو، سچ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس پورے ملک میں بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں"

ابوالکلام آزادؔ

مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب پہلا اڈیشن، صفحہ ۲۱۲

افسوس! جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گرانبار کیا، اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا، میری زندگی کا سارا ماتم یہی ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا، مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔ (ابوالکلام)

نقش آزاد (مرتبہ مولانا مہرؔ) صفحہ ۱۵۸

اس وجہ سے کہا کہ وزرا یعنے کانگریس منسٹری کی حکومت تو آپ نے دیکھ لی اب پریسیڈنٹ کو اگر بادشاہ کہا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

مولانا کے تبحّر علمی اور واقفیت عامہ کا یہ حال ہے کہ اُس کو صرف وہی شخص جان سکتا ہے اور اُس کی قدر کرسکتا ہے جس سے مولانا سے ذاتی ملاقات ہو یا اُسنے اُن کی کوئی تقریر سُنی ہو، میں نے ایسا جامع شخص اپنی عمر میں نہیں دیکھا، جس طرح آپ کو علم القرآن، تفسیر حدیث، فقہہ پر عبور ہے، اُسی طرح آپ تاریخ، سیاسیات اور فلسفہ کے عالم اور ٹھیک اُسی طرح شعر و شاعری اور فن تنقید کے بھی ماہر کامل ہیں آپ کی ذہانت، طباعی اور نکتہ رسی کا یہ کافی ثبوت ہے کہ مہاتما گاندھی ایسا شخص ہر سیاسی پیچیدگی میں آپ سے بیشتر مشورہ کرتا ہے اور ان سب کمالات کے باوجود آپ نے کسی اُستاد سے نہیں پڑھا، ایک مرتبہ "الہلال" میں ایک شخص نے دریافت کیا تھا کہ آپ نے کس سے پڑھا ہے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد سے ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں پھر اللہ کا یہ سب فیض ہے۔ اور یہ بالکل سچ ہے مجھ سے آپ سے چالیس برس کی ملاقات و دوستی ہے جب آپ کا سن ۱۳۔۱۴ سے زائد نہ تھا اُس وقت سے آج تک کسی شخص سے واقف نہیں جس کے آگے آپ نے زانوئے شاگردی تہہ کیا ہو، مجھ سے فرماتے تھے کہ بچپن میں مجھ کو ناولوں کا بہت شوق تھا اور مولانا نذیر احمد کا "توبۃ النصوح" اور مرزا محمد ہادی کی "امراؤ جان ادا" یہ دو ناول مجھ کو بہت پسند تھے، میں نے ان کو کئی بار پڑھا ہے۔ حفظ اشعار کی یہ کیفیت تھی کہ مولانا شبلی نعمانی جن کو خود ہزار ہا شعر ازبر تھے کبھی کبھی آپ سے پوچھتے کہ بھئی آزاد فلاں شعر کیا ہے۔ اسوقت یاد نہیں آتا یا فلاں شعر کس کا ہے اور یہ اُس کا جواب شافی فوراً دیتے۔ یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے کتب خانہ آپ کا مختصر مگر چیدہ و بے مثل، کوئی کتاب ایسی نہیں جو دیکھنے کے قابل ہو اور کتب خانہ میں نہ ہو۔

ایک مرتبہ جب شیعہ سنّی کا جھگڑا چکانے آپ لکھنؤ آئے اور حافظ ابراہیم صاحب کے یہاں ٹھیرے تھے میں ملنے گیا دیکھا کہ ہال کین کی "لایف آف کرائسٹ" نہایت خوبصورت مجلد آپ کی میز پر رکھی ہے میں نے مزاحاً پوچھا کہ کیا حضرت عیسیٰ سے بھی آپ اس انفصال میں مدد لیں گے۔ ہنسے اور کہا نہیں یہ کتاب اتفاق سے آگئی اس پر ایک ندوی صاحب نے جو موجود تھے استعجاباً پوچھا کیا آپ انگریزی بھی جانتے ہیں فرمایا کہ "جی ہاں کچھ شُد بُد پڑھ لیتا ہوں"۔ میں اس کتاب کو دیر سے پڑھ رہا تھا، میں نے مذاقاً پوچھا کہ بتائیے میری میگڈلین کون تھی اُس کا کچھ حال سُنائیے، سچ عرض کرتا ہوں کہ نامبردہ کے متعلق جو واقعات بیان کئے وہ میں نے کبھی سُنے بھی نہ تھے۔ میں نے کہا کہ یہ تو اس کتاب میں نہیں ہیں فرمایا کہ جی ہاں یہ فرینچ اسکالرنیاں نے اور فلاں فلاں نے اپنی کتابوں میں لکھے ہیں۔

اس ملاقات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا، ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں، خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کچھ خطوط اب بھی مرزا صاحب (مرحوم) کے صاحب زادے مرزا محمد وصی صاحب ایڈوکیٹ کے پاس محفوظ ہیں۔ من کیستم؟ نے ۱۹۴۲ء میں لباس اشاعت پہنا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب "انگریز بھارت چھوڑو" کی تحریک شباب پر تھی، اور مولانا احمد نگر کے قلعہ میں نظر بند تھے، اب مرزا صاحب نے ۱۹۵۱ء میں ۱۵ ستمبر کی رات کو قید خانۂ دُنیا سے سفر آخرت اختیار کر لیا، (اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔ آمین) لیکن مرزا محمد عسکری مرحوم نے "آثار بزرگی از ناصیتش ہویدا" کی شرح جس انداز میں کی ہے وہ آپ کے سامنے ہے، ملاحظہ فرمائیے ـــــ (خالدی)

میر نے سچ کہا ہے ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

یوں تو ہر شخص بظاہر انسان ہے مگر حقیقی انسان مدتوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب زمانہ کو اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی میں مفتی محمد عبدہ مصر میں اور جمال الدین افغان ایران میں پیدا ہوے۔ اس صدی میں ابوالکلام آزاد کا ظہور ہندوستان میں ہوا۔ جو کام اُن دونوں بزرگوں نے ممالک اسلامی میں کیا تھا وہی کام مولانا نے ہندوستان میں شروع کیا۔ اُس کی ابتدا، آپ نے مسلمانوں کی بیداری سے کی۔ پرچہ "الہلال" نکالا جس کی شہرت اور عزت اس قدر ہے۔ کہ اب بھی کسی کے پاس "الہلال" کی جلدیں نکل آئیں تو جس قیمت کو چاہے بیچ لے۔ جس کا طرز تحریر خاص تھا اور اُس کی تقلید و نقل محال نہیں تو مشکل ضرور تھی۔ اسباق قرآنی شروع کیئے جن میں آیاتِ قرآنی کی تفسیر و توضیح عجب انداز سے ہوتی تھی کہ اُنکو سُنکر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔ یہ "سبق" (لکچر) مولانا ہی کے دولت خانہ پر بوقت شب دو تین گھنٹہ روزانہ ایک چیدہ اور مخصوص جماعت کے سامنے ہوتے تھے جن میں مولانا ٹہل کر بیان کرتے، اور بالکل زبانی ہوتے تھے، میرے خیال میں ان ہی لکچروں کے نوٹوں سے بعد کو آپ کی مشہور تفسیر کلام مجید تیار ہوئی۔ ان لکچروں میں خاکسار اکثر شریک ہوا ہے۔

اسی مذہبی عشق نے پختہ ہو کر اور ترقی کر کے سیاسی صورت اختیار کر لی اور مولانا انڈین نیشنل کانگریس کے رکن رکین ہو گئے چنانچہ اب اُس کے پریسیڈنٹ یعنے بادشاہ بے تخت و تاج ہیں "بادشاہ" میں نے

علامہ سید سلیمان ندویؒ

یوسف ثانی

پیش نظر مقالہ علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء — ۲۲ نومبر ۱۹۵۳ء) کے زور قلم کا نتیجہ ہے، اس مقالہ میں حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ کی زندگی کے اس گوشے پر کیف آور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے، اور فضل و کمال کے ساتھ ساتھ سیرت و کردار کے اس پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے "جس کو رانچی (بہار) میں نظر بندی کی چار سالہ زندگی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مولانا کی زندگی کا یہ دور ایک مثالی دور تھا، اس دور کی اتنی جامعیت کیساتھ عکاسی سید صاحبؒ ہی کا حق تھا، اور یہ بات دوسروں کے لئے ممکن بھی نہ تھی — (خالدی)

اگر ہمارے نظر بندوں[ل] میں کوئی ایسا ہے جو اسوۂ محمدی پر فائز ہوا، تو ہم میں ایک اور ہستی ایسی ہے جو اسوۂ یوسفی کے درجہ پر ممتاز ہوئی، اور جو زندان میں بھی جاکر ترانہ سنج یَا صَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَ اَرْبَابٌ مُتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰہُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ہے۔ جس عزم، استقلال، استغنا، اور قوت ایمان کیساتھ یہ زمانہ مولانا نے بسر کیا ہے، وہ ائمہ سلف کی یاد کو تازہ کرتا ہے، شاید سب کو معلوم نہ ہو کہ انھوں نے حکومت کا وظیفہ لینے سے انکار کیا، اور اعانت نظر بندان کا ماہوار عطیہ بھی قبول نہیں کیا۔ اس زمانہ میں ان کو جو مالی دقتیں پیش آئیں وہ صرف عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ کے رمز میں پنہاں ہیں۔
یہ معلوم ہوگا کہ رات کو ان کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی، اس بنا پر وہ نماز عشاء کی جماعت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، یعنی انھوں نے گوارہ نہیں کیا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کے اصول سے انحراف کریں، انھوں نے حکومت سے اجازت چاہی، اور جب اس پر بھی کوئی جواب نہ ملا، تو انھوں نے برملا اعلان کر دیا کہ ادائے فریضۂ الٰہی میں انسانوں کے فرمان مانع نہیں آسکتے، لَا طَاعَةَ لِلْمَخْلُوْقِ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ — آہ ہم میں سے کتنے ہیں جو آزادی کے بستر سے بھی اٹھ کر خدا کے آگے سر نہیں جھکاتے ہیں، اور ایک وہ عباد صالحین ہیں جو قید و تنگی میں بھی مساجد الٰہی کی یاد فراموش نہیں کرتے۔

[ل] نظر بندان اسلام کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی ذات بابرکات کی طرف اشارہ ہے۔

کچھ یاد رہ گئے۔ میرے نزدیک مولانا کی شدید قوتِ حافظہ و قوتِ فکری نے نیز اُن کی اکابر دوستی نے اس درجۂ عالیہ پر اُن کو پہنچایا۔ اُن کو اپنے سے چھوٹوں اور ہم عمروں سے ملنے کا بالکل شوق نہ تھا وہ بوڑھوں کی صحبت کے عاشق تھے۔ مولانا شبلی سے اور اُن سے عمر میں باپ بیٹے کی نسبت تھی مگر جانبین ایک دوسرے کے عاشق تھے۔ مرزا غلام احمد قادیانی اتنے معمر بزرگ کی صحبت میں آزاد ہفتوں رہتے اور مرزا صاحب موصوف اُن کی صحبت سے اُکتاتے نہ تھے۔

اتنے کمالات اور خوبیوں کے ساتھ آپ اس قدر خلیق و متواضع اور دوست پرست ہیں کہ میں نے اس درجہ کے کسی دوسرے آدمی کو ایسا نہیں پایا۔ عنفوان شباب میں آپ سے بیحد دوستی و بے تکلفی اور روزانہ ملاقات و صحبت نصیب تھی۔ گھنٹوں غریب خانہ پر کرم فرماتے۔ ہواخوری کو روزانہ ساتھ جاتے چورنگی کے میدان میں مانومنٹ کی سیڑھیوں پر [illegible] رہتی واپسی میں کبھی کبھی فرپو کے رسٹوراں میں ہم دونوں کھانا کھاتے اور قریب دسؔ بجے کے گھر واپس آتے اللہ اللہ! وہ زمانہ اور وہ صحبتیں ہرگز بھول نہیں سکتیں۔ ایک مرتبہ آپ نے یہیں لکھنؤ میں مجھ سے پوچھا کہ کہئے حضرت ہماری آپ کی مُلاقات کتنے دن کی ہے۔ میں نے کہا ۴۸ برس کی۔ فرمایا کہ اگر دؔو شخصوں میں ۴۸ گھنٹے دوستی قائم رہے تو شکر کا مقام ہے چہ جائے ۴۸ سال۔ میں نے عرض کیا کہ آپ بالکل سچ فرماتے ہیں۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے! [1]

مَتاعِ فکر

سیاسی زندگی کی شورشیں اور علمی زندگی کی جمعیتیں ایک زندگی میں جمع نہیں ہوسکتیں اور بنیۂ دانش میں آشتی محال ہے، میں نے چاہا دونوں کو بیک وقت جمع کروں میں نامراد ایک طرف متاعِ فکر کے انبار لگاتا رہا، دوسری طرف برقِ خرمن سوز کو بھی دعوت دیتا رہا، نتیجہ معلوم تھا، اور مجھے حق نہیں کہ حرفِ شکایت زبان پر لاؤں۔ عرفی نے میری زبانی کہہ دیا ہے:-

زاں شکستم کہ بہ دنبالِ دلِ خویش مدام
در تشیبِ شکنِ زلفِ پریشاں رفتم

۱۶ نومبر ۱۹۴۲ء ڈسٹرکٹ جیل میرٹھ

ترجمان القرآن
دیباچہ طبع اوّل، جلد اوّل

[1] من کیستم؟ مصنفہ مرزا محمد عسکری صفحہ ۱۱۴ تا ۱۲۰

مولانا غلام رسول مہر

مردِ حق

یہ مولانا غلام رسول مہر صاحب (مرحوم) کا انتہائی پُراثر اور دلکش مقالہ ہے۔ مہر صاحب کو قدرت نے معجزانہ دماغ دیا تھا، وہ فضل و کمال کے پیکر، حُسن واخلاق اور شرافت کے پتلے تھے، ۱۵/اپریل ۱۸۹۵ء کو پھول پور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دیہاتی اسکول میں حاصل کی میٹرک، مشن اسکول جالندھر سے کیا، بی۔اے اسلامیہ کالج لاہور سے۔ تعلیم کے دوران ۱۹۱۴ء میں حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ سے روابط قائم ہوئے، ۱۹۱۵ء میں مولانا کی جماعت "حزب اللہ" کے رُکن بن گئے، ان روابط کا سلسلہ مولانا کی وفات تک قائم رہا۔ درمیان میں ایسے لمحات بھی آئے کہ جس میں مولانا کے سیاسی نظریات کی شدت کے ساتھ مخالفت بھی کی، مگر ساتھ ہی ساتھ یہی کہتے رہے کہ

> "ان سے بعض امور میں اختلاف تو ہو سکتا ہے، لیکن ان کے فضل وکمال اور خدمات سے انکار ممکن نہیں، مولانا آزاد سورج تھے، اور سورج بادل کی تاریکیوں میں بھی روشن رہتا ہے۔"

پھر جو جو زمانہ گذرتا گیا، یہ روابط انتہائی عقیدت ومحبت کی شکل اختیار کرتے چلے گئے، مولانا کی وفات کے بعد ان کی یاد نے جو نقش ابھارے، اس کا اندازہ "نقشِ آزاد"، "تبرکاتِ آزاد"، "باقیات ترجمان القرآن"، "رسولِ رحمت"، "انبیائے کرام" سے لگایا جا سکتا ہے۔ مضامین اور مقالات کی فہرست اسکے علاوہ ہے۔ اور جو اہتمام کام چھوڑا، اس میں حضرت مولانا کی جامع سوانح حیات بھی ہے۔ مکاتیب کا شمار بے انتہا مشکل ہے، ـــــ مولانا کے متعلق ان کا یہ نظریہ نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ

> "وہ خدا کا ایک نشان، ایک آیت، اور ایک برہان تھے، اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو محاسن وفضائل کے گہر ہائے شہوار کی ایک دُنیا ساتھ لے گئے، علم وعمل کا کون سا دائرہ ہے، جہاں ان کی شخصیت سب پر فائق وبرتر نہ رہی؟ وہ شمع گل ہوئی تو پوری مجلس پر ایسا اندھیرا چھا گیا کہ اب کچھ سجھائی نہیں دیتا۔" [1]

---

[1] افادات مہر ـ مرتبہ ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی ـ طابع شیخ غلام علی اینڈ سنس لاہور صفحہ ۱۵۲

رانچی ایک ایسا مقام تھا، جہاں مسلمان نہایت ذلّت ونکبت کی حالت میں تھے، جہالت اور باہمی خانہ جنگی نے ان کو گرد وپیش کے حالات سے ناواقف رکھا تھا، عیسائی مشنریوں کا جال تار کی طرح پھیلا تھا، عالم دین کا اس خطّہ میں وجود نہ تھا، مذہبی احساسات کی روح ان میں مردہ تھی لیکن مولانا کے پر توِ صحبت نے چند ہی سال کے بعد وہاں کی زمین وآسمان کو بدل دیا، اب ہم وہاں اسلامی انجمن کا نام سنتے ہیں، ایک مدرسہ اسلامیہ کی بنیاد وتعمیر دیکھتے ہیں، علماء مشاہیر کے مواعظ حسنہ کا جلوہ وہاں نظر آتا ہے، مذہب اور ملّت کی روح کو ان کے جسم وتن میں جنبش کرتے ہوئے پاتے ہیں، اور وہاں کے فقراء اور خاک نشینوں میں اب یہ حوصلہ دیکھتے ہیں، کہ علم کا پہلا کعبہ اس دیار میں وہ خود اپنے زور بازو سے قائم کرکے رہیں گے، جہاں ایک عالم دین کا وجود نہ تھا، وہاں اب کوششیں ہو رہی ہیں کہ سیکڑوں علمائے دین اسی کی خاک سے پیدا ہو کر اس سرزمین کو منور کریں۔ جہاں مسجدیں بے چراغ تھیں، وہاں ایک خورشید سے دیر وحرم سب اُجالا ہو گیا، جمعہ اور عیدین کے مجامع — اس سرزمین میں جہاں اسلام کی کوئی صحبت بہم نہ تھی، وہاں اب موکب شاہی کا دھوکا ہوتا ہے۔

زمانۂ قیام رانچی سے ایک سال تک جامع مسجد میں انھوں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا درس دیا۔ زیادہ تر اوقات تالیف وتصنیف میں بسر ہوا، ترجمان القرآن یعنی قرآن مجید کا مؤثر تفسیری ترجمہ اسی زمانہ میں ختم ہوا، "البیان" تفسیر قرآن میں ایک جامع تصنیف کا سلسلہ ۲۳ پاروں تک پہنچا، فقہ اسلامی پر بغیر فریقانہ تعصب کے، صرف کتاب وسنت کو پیش نظر رکھ کر متعدد رسائل الصلوٰۃ، الزکوٰۃ، الحج، النکاح، ترتیب دیے، سوانح مجددین کا سلسلہ شروع کیا، اور اس میں علّامہ ابن تیمیہؒ، علامہ ابن قیمؒ، اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ (محدث دہلوی) کے سوانح ومجتہدات قلمبند کئے، ایک رسالہ منطق اور بعض دوسرے عنوانات علمی پر تحریر کیا۔

ان سطروں کے لکھتے وقت مجھ کو یہ دھوکا ہو رہا ہے کہ کیا میں خود ابن تیمیہؒ اور ابن قیمؒ یا شمس الائمہ سرخسیؒ، اور امیہ بن عبد العزیزؒ اندلسی کے حالات تو نہیں لکھ رہا ہوں۔[۵]

[۵] ابوالکلام آزاد — مرتبہ عبد اللہ بٹ: ناشر کتب خانہ لاہور صفحہ ۵۹ تا ۶۱

فرمائیاں دکھاتا ہوا شام کے وقت مغربی سمت میں ڈوب جاتا ہے۔ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ (اگست ۱۸۸۸ء) کی کسی تاریخ کو انسانی زندگی کا ایک سورج وادی غیر ذی زرع میں حرم محترم کے پاس طلوع ہوا تھا اور ۲ شعبان المعظم ۱۳۷۷ھ (۲۲ فروری ۱۹۵۸ء) کو اپنا دورۂ حیات پورا کرکے دہلی کی سرزمین میں لال قلعہ اور شاہی مسجد کے درمیان غروب ہوا۔ ایسے سورج یقیناً صدیوں کے بعد طلوع ہوتے ہیں۔ اور آج دنیا پر خیرہ ذوقی کے جو سیاہ بادل تیزی سے چھاتے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے صدیوں کے بعد بھی کسی ایسے سورج کی درخشانیوں سے آنکھوں کو منوّر کر لینے کی کیا اُمید ہو سکتی ہے؟۔

مولانا کی زندگی ہر پہلو سے قدرت کا ایک عجیب و غریب نشان تھی۔ ان کی غیر معمولی فطری صلاحیتیں اسی عہد میں مشہور تاجداران علم و فضل کے لئے یکسر حیرت زا بن گئی تھیں جسے ہم عہدِ طفلی سے تعبیر کرتے ہیں اور کوئی بھی شخص زمانۂ طفلی کو عقل و دانش کے بلوغ اور فکر و نظر کی پختگی کا دور قرار دینے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ وہ بارہ تیرہ برس کی عمر میں ایسے شعر کہنے لگے تھے، جو مشّاق استادوں کو متحیر کر دیتے تھے۔ وہ بہ مشکل پندرہ سال کے ہوں گے جب انہوں نے کلکتہ سے ایک اصلاحی رسالہ بنام "لسان الصدق" (سچائی کی زبان) نکالا۔ ۱۹۰۵ء میں وہ سولہ سترہ سال کے تھے اور مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ندوۃ العلماء کے علمی رسالے "الندوہ" کی ایڈیٹری انہیں سونپ دی تھی اس کے بعد وکیل میں پہنچے جو اس زمانے میں ممتاز اسلامی اخبار تھا اور غالباً ایک سال اس کے ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۰۴ء میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اپنی تقریروں سے بہت بڑے مجمع کو مسحور کر لیا حالانکہ انجمن کے جلسوں میں کہن سال اور پختہ کار علماء و مقررین کو بھی بہ آسانی بار نہ ملتا تھا۔ مولانا کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال کی تھی۔ جب انہوں نے "الہلال" جیسا اخبار جاری کیا۔ جس کی کوئی مثال اس کے پیشتر کے جریدوں میں نہیں ملتی اور چھیالیس سال گذر چکے ہیں لیکن "الہلال" جیسا اخبار دوبارہ پاک و ہند کے علمی، مذہبی اور سیاسی افق پر نمودار نہ ہوا۔

پھر مذہب ہو یا دین، فلسفہ ہو یا تاریخ، سیاست ہو یا دعوت، ادب ہو یا شعر، غرض علم و فن کا کوئی شعبہ اور کوئی دائرہ ایسا نہ تھا، جس میں وہ اپنے تمام ہمسروں سے منزلوں آگے نہ تھے۔ انہوں نے بے تکلف صفحات کاغذ پر جو نقوش کھینچ دیے ان کی نقل و پیروی کے لئے مکمل یا نامکمل کوششوں کی مثالیں تو ضرور خاصی مل جائیں گی۔ لیکن ان سے بہتر نقوش کا نمونہ آج تک کون پیش کر سکا ہے؟

ان کی ہر ادا دنیا سے نرالی تھی۔ لوگ تخلص ڈھونڈھتے ہیں تو ایسا جو پہلے کسی نے نہ رکھا ہو یا کم از کم جو کسی مشہور شخصیت سے منسوب نہ ہوا ہو۔ لیکن مولانا نے اس دور میں "آزاد" تخلص اختیار کیا

افسوس! ۲۲ر نومبر ۱۹۵۸ء کا دن گزار کر رات میں ۲ بجے ہند و پاک کا با اصول مورخ، اُردو ادب کا بلند پایہ ادیب، بے مثل صحافی، بے شمار کتابوں کا مؤلف، مصنف مترجم اپنے داورِ حقیقی سے جا ملا، اب مولانا کی یاد کے ساتھ ساتھ ان کی یاد بھی سرمایۂ حیات ہے — (خالدی)

کیا کوئی شخص آنسوؤں کو الفاظ پہنا سکتا ہے یا آتش کدۂ حزن و غم کے شعلوں کو معرض تحریر میں لا سکتا ہے؟ کیا دل و جگر کے زخم پھیل کر صفحۂ کاغذ پر پھیلائے جا سکتے ہیں یا پہلو چیر کر سینے کے داغ دکھائے جا سکتے ہیں؟ ہو سکتا ہے ان ناممکنات کو بھی سحر طرازی کے ذریعہ سے حد امکان میں لایا جا سکے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ اشکباری، فغاں ریزی، چہرہ خراشی یا سینہ کوبی سے مولانا ابو الکلام آزاد کے ماتم کا حق ادا ہو سکے یا اس نقصان و خسران کی پہنائی و گہرائی کا اندازہ کیا جا سکے جو مولانا کی وفات سے علم و عمل، مکارم اخلاق، عزیمت و استقامت، ادب و سیاست اور دین و مذہب کی دنیاؤں کو پہونچ چکا ہے، یہ کہہ لینا سہل ہے کہ ایسی نادر ہستیاں صدیوں کے بعد عالم انسانیت کے لئے شرف و زینت کا باعث بنتی ہیں اور اس قسم کے الفاظ سینکڑوں اصحاب کی زبان پر بے اختیار جاری ہوئے، لیکن یقین جانیے کہ دائرۂ نقصان اس سے بدرجہا زیادہ وسیع ہے جتنا کہ ان الفاظ کے پیمانے میں سرسری طور پر نظر آتا ہے سنائی نے اپنے ایک مشہور قصیدے میں مدارج وجود پر گفتگو کرتے ہوئے کہا تھا۔

دور ہا باید کہ تا یک مردِ حق پیدا شود
بایزیدؒ اندر خراساں یا اویسؒ اندر قرن

یقیناً ایسے مردانِ حق دور گزر جانے کے بعد پیدا ہوتے ہیں جو اسلاف کے بہترین مکارم و فضائل کی درخشانیاں اپنے اندر جذب کر کے دنیا کے ظلمت زار میں روشنی کے بلند میناروں کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں تاکہ اندھیرے کی جگہ اُجالا پھیل جائے۔ تاریکی کی جگہ نور لے لے اور آنے والی نسلوں کی راہیں ان میناروں کی جلوہ گستریوں اور ضیا باریوں سے مدّت مدید تک کے لئے منور ہو جائیں۔ مولانا آزاد ایک ایسی ہی نادر شخصیت تھے، جن کے انوار نے ہماری نگاہوں کے ہاتھ میں علم و آگاہی کی مشعلیں دیکر ایک طرف اسلاف کرام کے عہد مسعود کا ٹھیک ٹھیک مشاہدہ کرایا۔ دوسری طرف آئندہ منزلوں کے سنگ ہائے میل موقع بہ موقع نصب فرما دیئے۔

زمانہ خدا جانے کب سے دور و سیر میں مصروف ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب تک اس کا یہ وظیفہ جاری رہے گا۔ سورج روزانہ صبح کے وقت طلوع ہوتا ہے اور دنیا کو اپنی آب و تاب کی کرشمہ

مولانا ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔

عزیمت واستقامت کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے کہ نظر بندی کی مدت کو شامل کرتے ہوئے انہوں نے پورے دس سال اور سات مہینے قید وبند میں گزارے۔ آخری قید کے دوران میں ان کی بیگم سخت بیمار ہوگئیں۔ جب ڈاکٹروں نے جواب دے دیا تو حکومت خاص شرطوں پر مولانا کو رہا کرنے کے لئے تیار ہوگئی۔ مگر مولانا نے مشروط رہائی کی پیش کش ٹھکرا دی۔ ان کی بیگم نے مفارقت کی حالت میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ خود انہوں نے خدا جانے زندگی کے اس حد درجہ دردناک سانحے کو کسی عالم میں سنا اور خون آرزو کے کس سیل میں سے گذرتے ہوئے اسے برداشت کیا۔ لیکن وہ مشروط رہائی کو قبول کر کے اپنے اصول کے اجلے دامن پر کوئی دھبا لگانے کے لیے تیار نہ ہوئے۔

مولانا کے والد ماجد کا حلقۂ ارادت بہت وسیع تھا۔ وہ خود بھی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو علم ومشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لئے خلقت کا جو ہجوم واحترام آج کل سیاسی لیڈروں کے عروج کا کمال سمجھا جاتا ہے وہ مجھے مذہبی عقیدت مندی کی شکل میں بغیر طلب وسعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔

والد ماجد کی وفات کے بعد مولانا اس وسیع حلقۂ ارادت کے مرشد بن گئے اور وہ مذہبی علوم میں جو درجہ حاصل کر چکے تھے اس کے لحاظ سے منصب ارشاد کے اہل تھے۔ لیکن انہوں نے یہ سلسلہ قائم نہ رکھا "الہلال" نکالا تو بہت کم مدت میں انہیں ایسی شہرت اور ہر دلعزیزی حاصل ہوگئی تھی جس کی مثالیں ہر جگہ نہیں مل سکتیں۔ چونکہ طبیعت خلوت دوست تھی اور اشد ضرورت کے بغیر باہر نکلنا پسند نہ فرماتے تھے اس وجہ سے ان کے لئے عوام کی طلب بہت بڑھ گئی تھی۔ پھر ان کی قیادت محض سیاست تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں مذہبیت کا عنصر غالب تھا اس لحاظ سے وہ دوسرے اصحاب کے مقابلے میں بہت زیادہ محترم مانے جاتے تھے تاہم جب ان کی رائے سیاسی امور میں عوام سے مختلف ہوئی تو ان کی شہرت و ہر دلعزیزی کو سخت صدمہ پہنچا۔ یہاں تک کہ ان سے غیر مناسب باتیں منسوب کرتے ہوئے بھی تامل نہ کیا گیا مگر ان کے علم ودانش کے مطابق صحیح راستہ وہی تھا جسے وہ اختیار کر چکے تھے۔ لہٰذا اس پر جمے رہے اور عوام کے دلوں میں ان سے عقیدت کے جو سنگین حصار ایک قرن پیشتر تعمیر ہو چکے تھے، وہ ایک ایک کر کے زمین بوس ہوتے گئے۔ ان کی زندگی کی یہ سخت ترین آزمائش تھی۔ ایک طرف یہ قلبی وروحانی اذیت

جب شمس العلماء، مولانا محمد حسین مرحوم جیسی بلند مرتبہ شخصیت اسے عالمگیر شہرت کے درجہ پر پہنچا چکی تھی اور اس وقت مرحوم زندہ تھے۔ کیا اس زمانے میں علمی حلقے کے ہر قابل ذکر فرد کا تاثر یہ نہ ہوگا کہ صاحب "آب حیات" و نیرنگ خیال"، جیسا رتبہ شہرت کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ تاثر بے شائبہ ریب درست تھا۔ تاہم مولانا ابوالکلام کے جلیل القدر کارنامہ ہائے گوناگوں نے اس تخلص کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ کسی کو مولانا محمد حسین آزاد سے اشتباہ کا وہم بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔

وہ اپنے حافظے کے لحاظ سے قدرت کا ایک عجوبہ تھے۔ قرآن مجید اور احادیث یا خاص مذہبی کتابوں کے سوا انہیں بیشتر علمی وادبی کتابیں، زیادہ سے زیادہ صرف ایک مرتبہ دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن تیس تیس پینتیس پینتیس سال بعد تک انہیں یہ بھی یاد تھا کہ جو مطلب وہ بیان فرمارہے ہیں وہ اصل کتاب کے دائیں بائیں جانب کے صفحے پر کس حصے میں درج ہے۔

مولانا نے "تذکرہ" میں ایک جگہ امام تیمیہ اور حافظ ابن قیم کے متعلق مولانا فضل رسول بدایونی کی کتاب "سوط الرحمٰن" کا حوالہ دیا ہے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا اور "سوط الرحمٰن" دیکھی تو حوالہ غلط نظر آیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ مولانا سے ذکر بھی کیا انہوں نے فرمایا کہ میرے حافظے میں تو عبارت اسی طرح محفوظ تھی جس طرح حوالہ دیا ہے۔ دو تین سال اس معاملے پر گزر گئے۔ پھر مجھے "سوط الرحمٰن" کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ مل گیا۔ اس سے واضح ہوا کہ مولانا کا حوالہ کتاب کے پہلے ایڈیشن سے تھا۔ دوسرے ایڈیشن میں مصنف یا ان کے متعلقین نے عبارت میں ترمیم کرلی تھی اور میرے پاس کتاب کا دوسرا ایڈیشن تھا۔

"غبار خاطر" میں ایک مقام پر حکیم صدرائے شیرازی کا یہ شعر لکھا ہے ؎

کم لذتم و قیمتم افزوں زشمار است
گوئی ثمر پیش رس باغ وجودم

ساتھ ہی لکھا ہے کہ یہ شعر تذکرۂ "آفتاب عالمتاب" میں نظر سے گذرا تھا۔ بائیں طرف کے صفحے کی ابتدائی سطروں میں ملے گا اور تذکرہ مذکورہ اس تحریر سے تیس برس پیشتر دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔

یہ ان کے علمی کمالات تھے۔ لیکن ان کی شخصیت کا ممتاز ترین وصف یہ تھا کہ وہ علم وعمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انہوں نے اپنے عقاید واصول اور ارشادات ودعوات کے سلسلے میں عزیمت و استقامت کے جو نمونے پیش کئے ان کی مثالیں یقیناً بہت کم ملیں گی، رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم اور سید الاحرار مولانا حسرت موہانی نے لاریب اپنے اصول کے لئے نہایت عظیم الشان قربانیاں کیں اور عمل میں ان کا درجہ مولانا کے برابر ہے۔ لیکن محض علم ہی نہیں بلکہ علم کے تنوع اور بوقلمونی میں

اقوالِ زریں

مولانا ابوالکلام آزادؒ

(۱) ہدایت کی آواز کبھی نئی نہیں ہوتی کہ دُنیا کی یہی سب سے زیادہ پرانی چیز ہے۔

(۲) "اسلام تو اعتقاد وعمل کی ہر صداقت، اور کائنات کے ہر حُسن وجمال کا نام ہے، جہاں کہیں صداقت اور جمال موجود ہے، یقین کرنا چاہئے کہ وہ اسلام ہے، گو دُنیا کو اس کی خبر نہ ہو"

(۳) جن عزتوں پر خدا کا ہاتھ نہیں ہوتا، وہ گو کتنی ہی نظر فریب ہوں، مگر پائدار و مستحکم نہیں ہوتیں"

(۴) "روشنی جب نکلتی ہے، تو ہر طرح کی تاریکی دور ہو جاتی ہے، خواہ مذہبی گمراہی کی ہو، خواہ سیاسی"

(۵) "اگر ہوا موافق نہ ہو، دریا مہربان نہ ہو، اور ستارے رہنمائی نہ کریں تو کشتی بان کیا کر سکتا ہے"

(۶) "خطرات سے مقابلہ زندگی اور حرکت میں ہوتا ہے، جمود اور سکون میں نہیں ہوتا"

(۷) "قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ ہم خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں"

(۸) "آپ کہتے ہیں کہ مسجد کا منارہ سیدھا نہیں، میں روتا ہوں کہ بنیاد ٹیڑھی ہے"

(۹) "دُنیا میں صرف سچائی اور خلوص میں زندگی ہے، خلوص کبھی ضائع نہیں جاتا، اور سچائی کبھی نہیں مرتی"

(۱۰) "سچ کی کسوٹی اس کے حامیوں کی کثرت نہیں ہے، اس کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے"

(۱۱) "نیک عمل کو اچھا کہو، کیونکہ بغیر اس کے دُنیا میں نیکی زندہ نہیں رہ سکتی"

(۱۲) "یہاں پانے کا مزا اُن کو مل سکتا ہے، جو کھونا جانتے ہیں"

(۱۳) "اگر تم ایک برف خانہ بنا کر، اس کا نام آتش کدہ رکھ دو گے، تو کیا برف کی سل انگارہ ہو جائے گی؟"

(۱۴) "پالیٹکس ایک آگ ہے، جو خود بھڑکتی ہے، پھر بھڑکائی جاتی ہے، وہ برف کا گلاس نہیں ہے، جو کسی سرد مہر ساقی کی بخشش پر موقوف ہو"

(۱۵) "زندگی صرف قوت میں ہے، اور اعتماد کی جگہ دل ہے، نہ کسی کی چوکھٹ"

(۱۶) "دلوں کی اقلیم میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب ہو جاتا ہے اور اسی انقلاب سے اس دُنیا کے انقلابات وابستہ ہیں"

(۱۷) "اسلام کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتا کہ مسلمان آزادی کھو کر زندگی بسر کریں، انھیں مر جانا چاہیئے یا آزاد رہنا چاہئے، تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں"

مگر جس راستے کو وہ درست سمجھتے تھے اس سے ملت کے بہت بڑے طبقے نے نہ محض اعراض کیا بلکہ اسے مغضوب ترین راستہ قرار دیا۔ دوسری طرف ان کی متاع ہر دلعزیزی جل کر راکھ ہوگئی۔ لیکن اس آزمائش میں بھی ان کا قدم لغزش سے آشنا نہ ہوا۔ یہاں یہ بحث چھیڑنے کا موقع نہیں کہ ان کی رائے درست تھی یا نہ تھی۔ صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ انہوں نے اپنے معتقدات کی پیروی میں کس شان عزیمت سے بے دریغ ہر قسم کی قربانیاں کیں۔ جس دور میں عارضی اور بے حقیقت نفع جوئیوں کے لیئے بڑے بڑے اصول بے تکلف ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ اس دور میں مولانا جیسی شخصیت کی عزیمت و استقامت کے صحیح اندازے کی بھی اُمید چنداں کامیاب نہیں ہوسکتی۔

ان کے اوصاف و محامد کی داستان بڑی ہی طویل ہے اور انہوں نے مختلف دائروں میں جو مثبت اور ہمیشہ درخشاں رہنے والے کارنامے انجام دیے۔ ان کی تفصیل دفتروں کی محتاج ہے۔

مولانا کو خود بھی بعض اوقات یہ احساس ہوتا تھا کہ جس دور میں وہ پیدا ہوے اور جن حالات میں انہیں زندگی گذارنی پڑی وہ ان کے لئے سازگار نہ تھے۔ ایک طویل مکتوب کے آخر میں فرماتے ہیں

> "افسوس کہ زمانہ میرے دماغ سے کام لینے کا کوئی سامان نہ کرسکا ..... بعض اوقات سوچتا ہوں تو [illegible] پر حسرت و عالم کا ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا ہے، مذہب علوم و فنون ادب، انشاء شاعری کوئی وادی ایسی نہیں ہے جس کی بے شمار نئی راہیں مبدء فیاض نے مجھ نامراد کے دل و دماغ پر نہ کھول دی ہوں۔ اور ہر آن ہر لحظہ بخششوں سے دامن دل مالامال نہ ہوا ہو۔ بہ حدے کہ ہر روز اپنے آپ کو عالم معنی کے ایک نئے مقام پر پاتا ہوں اور ہر منزل کی کرشمہ سنجیاں پچھلی منزلوں کی جلوہ طرازیاں ماند کردیتی ہیں۔ لیکن افسوس کہ جس ہاتھ نے فکر و نظر کی ان دولتوں سے گراں بار کیا۔ اس نے شاید سر و سامان کار کے لحاظ سے تہی دست رکھنا چاہا۔ میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا۔ مگر اس کے حوالے کر دیا گیا"

غالب نے اپنے متعلق کہا تھا لیکن یہ مولانا کی زبان کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

عمرہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد[۱]

لیل و نہار، لاہور ۲ مارچ ۱۹۵۸ء

[۱] مولانا ابوالکلام آزاد — ایک شخصیت، ایک مطالعہ، مرتبہ پروفیسر ابوسلمان شاہجہانپوری شائع کردہ سندھ ساگر اکاڈمی لاہور صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۳۔

(۱۸) "ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کیلئے
جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے،
مگر آپ کے لئے ایک دینی فریضہ"

(۱۹) اکثر انقلاب کی ابتدا نہایت خراب
دکھی جاتی ہے، مگر قوم جب تک
آزادانہ زندگی بسر نہ کرے،
وہ آزادی کے صحیح استعمال
سے واقف
نہیں
ہوسکتی

(۲۰) ہر طاقت ور ہاتھ جس میں
تلوار ہو، اپنے مخالف کو
شکست دے سکتا ہے،
لیکن تحسین اس فاتح کے لئے ہے
جو
اسلحہ کے استعمال کے بغیر
حریف کو اپنے قابو میں
کرلے"

ابوالکلام
آزاد

"خرمن و برق کا معاملہ، آتش و خس کا افسانہ،
ان سب کی سرگذشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجئے
میری پوری سوانح عمری بھی انھیں میں مل جائے گی،
نصف افسانۂ اُمید اور نصف ماتم یاس!
عاشق نہ شدی، محنت اُلفت نہ کشیدی
کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید؟
ابوالکلام آزاد
"تذکرہ" طبع اوّل، صفحہ ۲۹۰

"جو شخص
پیشوائی اور
رہنمائی کی زندگی اختیار
کرتا ہے، اس کی زندگی کا
کوئی حصّہ پرائیوٹ نہیں ہوسکتا، اور
اگر اس کی زندگی میں کوئی راز ہو، تو
وہ پیشوائی کا اہل نہیں، وہ جو کچھ گھر کے
اندر کرتا ہے اس سے بھی بحث کرنے کا
پبلک کو حق حاصل ہے"
"ابوالکلام"

"یاد رکھو
کہ ہر محبت
کے لئے ایک
بغض لازمی ہے، اور کوئی
عاجزی نہیں کرسکتا جب تک کہ متکبر و
مغرور بھی نہ ہو، نیکی کو اگر پسند کروگے،
تو اس کی خاطر بدی کو بُرا کہنا ہی پڑے گا، اور
خدا کو خوش رکھنا چاہتے ہو تو شیطان کی دشمنی
کی پرواہ مت کرو"
"ابوالکلام"